شمعِ شبستان

جہانگیر بک کلب چابکسواران لاہور

(مطبوعہ کریمی پریس لاہور)

۷۸۶

شمع شبستان

یعنی

مشاہیر اہلِ قلم کے مختصر افسانے

مرتبہ

جہانگیر بک کلب

چابکسواراں

لاہور

۱۹۲۵

بارِ اول ۱ (مطبوعہ کریمی پریس لاہور باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر) قیمت [illegible]

فہرست مطالب

تقریب

تاریخ ادبیات اس بات کی شاہد ہے کہ قصہ گوئی مشرق کی سرزمین سے ہی پیدا ہوئی ہے
افسانہ نگاری کا بہترین دور جسکے موجد عربی مسلمان ہیں۔ اس دور کی عمدہ مثال الف لیلہ کو آج یہ فخر
حاصل ہے کہ کوئی صدی گزر جانے کے بعد بھی دنیا کی کوئی زبان افسانوں میں اسکا بدل پیدا نہیں
کر سکی۔ اسکا ترجمہ دنیا کی ہر ایک زبان میں ہو چکا ہے۔ یورپ میں اسکے ہزاروں مصور ایڈیشن
نکلے ہیں اور قدرمندی کی یہ حالت ہے کہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ یورپ کے کئی
افسانہ نگاروں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی تصانیف کو اسکے مقابل
پیش کر سکیں لیکن جو مقبولیت عامہ اس کو حاصل ہے وہ اسکی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ سکے
ہندوستان میں عہد مغلیہ سے پہلے بخارا میں انوار سہیلی کے نام سے کلیلہ دمنہ
کا ترجمہ ہوا تھا عہد اکبری میں علامہ ابوالفضل نے انوار سہیلی کے مصنف ملا حسین واعظ
کاشفی کے اس الحاق کو جو کہ اسنے اصل قصہ میں کیا تھا ناحق قرار دیکر بہ صاحب سخن شناسی
اور دقیقہ رسی سے عیار دانش لکھی۔ علامہ ابوالفضل نے انوار سہیلی کے قلم انداز شدہ
ابواب کو شامل کتاب کر کے اور ساری کتاب میں سے فضول عبارت اڑائی۔ دور از کار
استعارات اور بے محل اشعار سے احتراز کر کے اسے صحیح مذاق سخن کا نمونہ دیا
عہد اکبری میں علامہ ابوالفضل کے بھائی علامہ فیضی نے بادشاہ کے کہنے پر
ملا مستوفی باعصمی ضخیم کتاب فارسی زبان میں تصنیف کی جو چھیالیس جلدوں پر منقسم
ہے اس کے بعد مختلف کتابیں اس فن میں اضافہ ہوئیں اور اس فن کو یہاں تک
ترقی ہوئی کہ خاندان شاہی کے ہر ایک معزز ارکان کے لئے ایک ایک قصہ گو

مولوی عبدالحلیم شرر نے کئی رسالے تصنیف کئے ہیں۔ آپکے اکثر رسالوں کا پلاٹ
تاریخی ہوا کرتا ہے۔ مولوی صاحب کا سارا کیرکٹر ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا نظر
آتا ہے۔ اگر سرور عرب وعجم کا رہنے والا ہے تو فقط اس کا لباس ہندوستانی ہے
اس کی رفتار وگفتار کا انداز ایک ہی ہے عزیز ومنصور میں سوائے جائے سکونت
وغیرہ کے کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ شاعرانہ طرز تحریر اور اظہار جوش سے اکثر پلاٹ
میں کمزوری واقع ہوگئی ہے۔ باوجود ان کمزوریوں کے آپکے طرز تحریر میں بلا کی کشش پیدا
ہوئی ہے اور یہی بڑی خصوصیت آپکے فسانوں میں ہے۔ اور یہی آپکی شہرت کا باعث ہے۔

آپ نے جس قدر ہندوستانی طرز معاشرت پر رسالے لکھے ہیں ان میں گو آپ کو خاطر خواہ
کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن پھر بھی حسن کا ڈاکو۔ دربار حرام پور کے اسرار۔ ماہ ملک
وغیرہ وغیرہ میں آپکو اچھی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس نے دلکش بدرالنساء کی
مصیبت اور میوہ تلخ آپکی تصانیف بدنما دھبے ہیں آپکے تاریخی رسالوں میں ایک نقص
یہ بھی واقع ہوا ہے کہ ان میں صحیح حالات کہیں نہیں پائے جاتے کیونکہ ایسے واقعات
سے عوام میں غلط خیالات مروج ہو جاتے ہیں اور لوگ خلاف واقعہ امور کو تاریخی واقعات
تصور کرنے لگتے ہیں۔ اردو میں مولانا آزاد اسی بات کا شکار ہوئے ہیں۔ باوجود ان
کمزوریوں کے آپ ایک مشاق فن ہیں اور آپ اس فن کے وہ معمار ہیں کہ آپ نے
ہر ایک اینٹ کو اس خوبی و کوشش سے تراش کر عمارت میں لگایا ہے کہ عمارت کا ظاہری نقشہ دیکھنے
والوں کو ایک نظر میں ہی گرویدہ کر لیتا ہے

پنڈت سرشار اور مولوی عبدالحلیم شرر صاحب کے علاوہ اور بھی بہت سے
افسانہ نگار اس طرز جدید میں لکھنے والے ہوئے ہیں جن میں بعض کو تو کافی کامیابی حاصل

ہوئی ہے۔ اور بعض دو چار مراحل رہی تھک کر رہ گئے ہیں

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی آپکو اردو داں کافی سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔ آپ نے مختلف مذہبی مسائل اور نرالی ہندوستانی طرز معاشرت کو قصے کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ آپکا لکھنے کا مقصد محض مرد عورت اور لڑکوں کی اصلاح ہے۔ مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ رویائے صادقہ وغیرہ وغیرہ اسکی مثالیں ہیں۔ ان افسانوں میں آپ نے روزمرہ کی زندگی کی سچی تصویریں کھینچی ہیں۔ اس پر خوبی یہ کہ آپکے طرز بیان کی ادائیگی دلوں میں خود بخود دگھر کئے جاتی ہے اور آپ نے اپنی تصانیف کے لئے پلاٹ اور کیریکٹر بھی وہ چنے ہیں کہ جو متحرک تصاویر کی مانند چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً اصغری۔ اکبری۔ کلیم نصوح۔ وغیرہ وغیرہ

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین صاحب نے بھی آپ کے نقش قدم پر چل کر اس طرز خاص کو ایک حد تک نبایا ہے۔ آپ نے بھی لڑکیوں اور بیاہی ہوئی بہوؤں کی اصلاح کے لئے کئی افسانے تصنیف کئے ہیں۔ آپ کے پلاٹ بھی ہماری معاشرت کا آئینہ ہوتے ہیں اور آپکا طرز بیان بھی نہایت مؤثر سلیس اور دلپذیر ہے آپکو اپنے والد صاحب کی طرح اردو زبان پر خاص قدرت حاصل ہے۔ آپکی تصانیف میں اقبال دلہن۔ حسن معاشرت بچیوں سے دو دو باتیں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مرزا ہادی حسین صاحب بی۔ اے نے بھی اس طرز میں خاص جدت پیدا کی ہے۔ آپ نے متعدد افسانے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں وہاں کی سوسائٹی

کے حالات پر لکھے ہیں آپ کی طرز تحریر لہر اور پلاٹ بہت مؤثر اور موزوں ہوتا ہے۔

منشی سجاد حسین مرحوم نے بھی کئی افسانے تصنیف کیے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں طرحدار لونڈی، احمق الذین، حاجی بغلول۔ کا پلاٹ لکھنؤ کے طبقہ خاص کی زبان کا ایک سچا مرقع ہیں آپ نے سرشار کے رنگ میں اکثر افسانے لکھے ہیں اور سرشار کی سلسلہ زبان کامیاب ہوئے ہیں۔

حکیم محمد علی نے مولانا شرر کے رنگ میں اکثر افسانے لکھے ہیں۔ جعفر و عباسہ میں آپ بھی مولانا شرر کی طرح تاریخی واقعات میں کہیں کہیں لغزش کھا گئے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ ایڈیٹر زمیندار۔ آپ نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ آپ نے متعدد افسانے انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کیے ہیں۔ آپ افسانہ کی ماہیت اس کے پلاٹ اور کیرکٹروں کے مفہوم کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں حیدرآباد میں سے ایک رسالہ فسانہ بھی نکالا کرتے تھے ایک ڈرامہ جنگ روس و جاپان بھی تصنیف کیا ہے ایک اچھے اردو لکھنے والے ہیں آپ کی خدمت کا اعتراف ملک جس طرح بھی ادا کر سکے بجا ہے

قاری سرفراز حسین صاحب ایڈیٹر قوم و تمدن نے طوائف کی پر اسرار زندگی پر۔ سعید۔ سعادت۔ شاہد رعنا۔ اور سرائے علی چار ناول تحریر کیے ہیں اور اسی سلسلۃ الطوائف کو اور بھی طول دیا ہے۔ آپکی طرز تحریر پلاٹ اور زبان عام فہم ہے اپنے نوجوانوں کی اصلاح و بہبود کے لیے چند اور بھی قصے تحریر کیے ہیں۔

مرزا محمد سعید صاحب ایم اے نے خواب ہستی۔ یاسمین دو ناول تحریر کیے ہیں جو نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ دونوں ناولوں کا

ملاٹ لوجوانوں کی روزمرہ کی زندگی کا مرقع ہے۔ زبان نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے۔ جو مقبولیت خواب ہستی کو نصیب ہوئی ہے وہ پاسمن کو میسر نہیں ہوئی۔

افسانوں کی اس طرح جدید کے بعد ملک میں مختصر افسانہ نویسی کی طرف خاص پیدا ہوئی ہے۔ گو موجودہ زمانہ میں مختصر افسانہ نویسی کو ہمارے ادب میں ادب کی جان تسلیم کیا گیا ہے مگر جو ترقی اس صنف میں اہل مغرب نے کی ہے وہ ابھی ایشیا والوں کے لئے بہت دور ہے۔ ابھی طرز خاص میں لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے مگر پھر بھی اس مجموعے میں ان مختصر افسانہ نویسوں کے افسانے یک جا جمع کئے ہیں جنکو اس فن میں ید طولےٰ حاصل ہے

مسٹر سجاد حیدر یلدرم۔ مولانا راشد الخیری۔ سلطان حیدر جوش۔ خواجہ حسن نظامی۔ پریم چند۔ انہوں نے اس طرز خاص کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ ہماری زبان کی بدقسمتی ہے۔ جو ابھی کثرت سے مختصر افسانہ اچھا لکھنے والے پیدا نہیں ہوئے جو اس عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں ہندوستان میں بمقابلہ یورپ کے اگر کسی قوم نے اس فن میں ترقی کی ہے اور اس کے ذریعے ملک اور زبان کی خدمت انجام دہی ہے تو وہ بنگالی قوم ہے مختصر افسانہ نویسی کی قلیل عمر پر اگر غور کیا جائے تو ہمیں ناامید و دلشکستہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ جسکا حال اسقدر رسان دار ہو اس کا مستقبل خدا جانے کس قدر شاندار ہوگا اور وہ دن قریب ہے کہ اردو میں بھی ہزاروں ٹیگور۔ اناتول فرانس اور کیلنگ پائے جائینگے۔

ہم نے افسانوں کے انتخاب میں اس بات کو مدنظر رکھا ہے اور اس
مجموعے میں ہر افسانہ اس فن میں ایک نئی ساح کا حامل ہے۔ کہیں کیریکٹر
کی جدت، کہیں پلاٹ کی دلچسپی اور کہیں طرزِ تحریر کی دلپذیری پائی جاتی
ہے غرض ہر افسانہ ایک شاندار عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔

نکاح ثانی

گھڑی گھرر گھرر کر کے گئی، دونوں نے ایک ساتھ نظریں اٹھائیں نوجوان عورت انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ایک خط پڑھ رہی تھی، چھوٹی لڑکی گڑیا کو ہاتھ میں لئے اور دائیں ہاتھ کی انگلی اردو کی پہلی کتاب کی ایک سطر پر رکھے، گڑیا کو وہ سبق جو خود اُسے آج پڑھایا تھا پڑھا رہی تھی "کتا بھونکتا ہے بلی میاؤں میاؤں کرتی ہے۔ اونٹ بلبلاتا ہے" دونوں کی آنکھیں ایک دم اٹھیں اور گھڑی پر پڑیں۔ نوجوان عورت نے اپنے دل میں کہا "نو نو بج گئے" لڑکی نے گھڑی پر سے ماں کے چہرے پر نظر ڈالی، اور ماں کے لئے بہانہ ڈھونڈھ کے کہنے لگی "اماں جان، گھڑی نو دفعہ بجی؟"

ماں نے منہ سے کچھ نہ کہہ سکی، مگر ذرا سر ہلا کے گویا "ہاں" کہا۔

بچی نے تھوڑے سے تردد کے بعد پھر پوچھا، "ابا جان کا انتظار کب تک کریں گے؟"

ماں نے اس کا بھی جواب کچھ نہ دیا

ہاں انتظار کریں گے، ہمیشہ یوں ہی انتظار کریں گے۔ عورت نے کاغذ کو پھر اٹھایا، آہ اگر اب بھی آئے، اور نگاہ حسرت سے اسے دیکھے تو وہ، اس کا نام، یہ دستخط کے کاغذ کو پھاڑ ڈالے گی، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گی، اور بالکل صاف کر دینے کے لئے انگیٹھی میں ڈال کے راکھ کر دے گی، اُسے یقین نہ کرے گی اپنے شوہر کی وفات کی اطلاع دینے والے کاغذ پر ذرا سا بھی یقین نہ کرے گی

نائلہ کیا یہ ممکن ہے، لوگوں کہتے، جو ہر دوسرے تیسرے رات رات بھر غائب
ہو جایا کرتے ہیں، یہ سب بے وفائی کا نتیجہ ہے، یہ سب کسی بیسوا کو دل دے کا باعث ہے
یہ جو کہا جایا کرتا تھا، کہ آج کچہری سے فلاں دوست کے ہاں دعوت ہے، سارا رات کو نہ آسکوں،
آج کمیٹی باغ میں بیٹھ بستا رہا، اس لئے دیر ہو گئی، آج فلاں جگہ جلسہ تھا، اسلئے جلد نہ آسکا،
یہ سب عذر جنہیں وہ تسلیم تو کیا کرتی تھی، مگر دھڑکتے ہوئے دل سے کہ کہیں جھوٹ نہ ہوں، یہ سب
عذر جھوٹ ہی تھے، اور صرف یہ کاغذ، یہ ایک عبارت جو اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ہنسی
اڑاتی معلوم ہوتی ہے، صحیح ہے؟"

یہ کاغذ اور وہ تو اس کا نام، اس کا کوٹھا، اور تمام تفصیلات تک سامنے کہتا ہے" اگر چاہو
تحقیق کر لو، یعنی بالکل صحیح ہے؟ انکار کی مجال نہیں، اس کے جھوٹ ہونے کا احتمال نہیں، یہ خیال
اسے گویا شکنجہ میں دبا دبا کر پیسے ڈالتا تھا۔

اور اسی وقت، ایک منٹ میں گزشتہ واقعات، ماضی کے سترسن پردے کو ہٹا کے ایک دم
اس کے سامنے آکھڑے ہوئے وہ باتیں، وہ عذر جو اُسے اپنے شوہر کی زبان سے سنے تھی
اور مان لئے تھے، وہ گراں واقعات جنہیں اُسے تحمل کیا تھا اور بھول گئی تھی، وہ لڑائیاں جو
معلوم کیوں اُن میں ہوئی تھیں، باوجودیکہ خود اُسے کبھی اپنے شوہر سے لڑنے کا ارادہ نہیں
کیا تھا، وہ تحقیریں اور جھوٹی چھوٹی اہانتیں جو اُسکی کی جاتی تھیں اور جنہیں وہ معاف کر چکی تھی
اور بھول چکی تھی، یہ سب پردہ ماضی سے نکلکر قطار در قطار سامنے آکھڑی ہوئیں، اور اپنے
اصلی رنگ میں، اس رنگ میں جنہیں انہیں بھولنا، معاف کر دینا، برداشت کرنا ممکن نہ تھا،
اپنے تئیں ظاہر کرنے لگیں

اور اس وقت وہ ان کے عذاب سے تنگ آگیا اور اس کے جگر میں جو اختلاج پیدا

ہو رہا تھا، اس سے معلوم ہو کر اسے ہاتھوں کو مل رہی ہے جسم کھڑا رہا ہے۔
اپنی انگلیوں کو اس طرح اینٹھ رہی ہے گویا توڑ ڈالے گی، ہاتھوں کو اس طرح نوچتا ہے اگر ان
اپنے کندھوں سے اکھاڑ دینا چاہتی ہے،

چلانے کے لئے، رونے کے لئے اس کو بہت بڑی ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن
اس کا عذر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی، یقین نہ کر سکی کوشش کر رہی تھی۔ اب اُسے اسی نگاہیں
اس کاغذ پر سے اٹھا کر دیوار پر ڈالیں جہاں کچھ اونچے پر سامنے شوہر کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ گویا
اس چہرہ میں، اس اہانت، اس سودائی کے جھوٹ ہونے کی علامتیں دیکھنا چاہتی تھی اور
اس وقت، چند منٹ میں اسی بیاہی زندگی کو پھر دوبارہ بسر کر گئی اس کی بیاہی زندگی کی مرقع اس
طرح گذر گئے جس طرح کسی منبع سے مختلف رنگ کی روشنیاں کسی چہرے پر یکے بعد دیگرے پڑیں
ان مرحلوں میں وہ چہرہ خود اس کے مقابل تصویر میں ہنس رہا تھا، ہمیشہ ہوتا تھا

وہ پہلی رات، وہ اس رات کو اسے چاہتا تھا! وہ رات جب کہ وہ تمام تحسیات قلبی کے ساتھ
اس سے کانپ کانپ کر باتیں کر رہا تھا! اور وہ مارے شرم کے پریشان و لرزاں تھی اور اس کے چہرے کو نہ
دیکھتی تھی۔ اس رات بلاشبہ وہ اسے چاہتا تھا۔ ہاں صرف اُسے چاہتا تھا

۔ بیچاری لڑکی، اس رات، اسے کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کے، اُسکی باتیں سن سن کے تہ دل
سے یقین کر رہی تھی کہ یہ مسرور و مسعود رات، شبِ عشق ہو کر لیل و صال بنکر ہمیشہ قائم رہیگی، ابد ختم
نہ ہو گی

اس کے بعد مرقع کا ایک اور صحیفہ پیش نظر ہوا ایک دن صبح کا وقت تھا وہ سوتے سوتے یکایک
جاگی کیا دیکھتی ہے کہ وہ خواب سے بیدار ہے، اس کے قریب بیٹھا ہے اور ایک الفت بھری مخصوصیت سے
آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے ہے وہ سونے میں اس طرح دیکھے جانے سے لجائی اور اسی

گھبراہٹ اور شرم کو چھپا نہ سکی کہ اتنے میں اُس نے اُس کے موبہہ کو جو حیرت سے کھل گیا تھا۔ ایک
لمبے بوسے سے بند کر دیا۔ آہ یہ بوسے لیکن اس وقت تو زندگی بوسوں ہی میں گذرتی تھی۔ اُس زمانے
میں وہ یہ خیال کرتی تھی کہ زندگی، ایک دائمی بوسۂ عشق ہے یہانتک کہ ایک دن ان بوسوں میں،
ان رسوں کے درمیان، اس نے زہر کا ایک گھونٹ چکھا کوئی سبب نہ تھا، کوئی وجہ بظاہر معلوم
نہیں ہوتی تھی، کہ ایک دن اسے ان عشق کے بوسوں میں چھپی ہوئی ایک کھٹک محسوس ہوئی جس نے
اُس کے قلب، اس کی روح تک جا کر ایک ضرب لگائی

اس اس وقت، اُس سیکنڈ سے اُسے ایک مبہم، غیر معنی ڈر نے ستانا شروع کر دیا۔ لیکن اگر یہ
غیر حسی خوف، غیر معنی ہی رہتا، تو وہ ایک پرلطف خواب کی بے معنی گھبراہٹ پر محمول کر کے، اپنے دل کو
دھوکہ دے دے کر خوش رہتی۔ مگر یہ بھی نہ ہوا

ایک دن اتوار کا دن تھا۔ وہ گھر سے نکلتے وقت، اس کی طرف نہ دیکھ سکے یہ کہتا ہوا کہ "شاید
اس طرح دیر سے آؤں" جانا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی نظروں میں وہ وقت اور موقع پھر رہا
ہے جب اُس نے پوچھا "کیوں؟" اور اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملانا چاہیں، تو اُسے جھوٹ
بولنے والوں کی مخصوص پریشانی کے ساتھ، اپنی چھڑی کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "آج
اتوار کا دن ہے شاید دوستوں کے ساتھ سیر وغیرہ میں دیر ہو جائے" پہلا جھوٹ! اس پہلے جھوٹ پر
یقین نہ کر سکنے کے لئے اُسے تمام رات کوشش کی تھی، تمام رات اپنی طبیعت کو یہ یقین دلانے کی کوشش
کر رہی تھی کہ یہ عذر جھوٹ نہ تھا، اور اس کوشش میں اُس کی واپسی کے وقت تک آنکھ بھی نہیں
جھپکائی تھی۔ آخر وہ واپس آیا، اس واپسی کے وقت، وہ اس کی زبان سے ایک کلمۂ تسلی، ایک
حرف اعتذار سننے کی امید رکھتی تھی

"تم اب تک سوئی نہیں؟"

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی"

اس جواب پر اگر وہ ایک حرف ہی کہتا ایک حرف بس، تو اسے اصطلاحات کو وہ فوراً بھول جاتی، مگر اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ رات کے کرتے جلد جلد بدلے، پلنگ پر لیٹتے وقت اس نے اس کا بوسہ لیا، مگر اس بوسہ میں ایک اجتناب، ایک رکاوٹ ملی ہوئی تھی۔ پلنگ پر اس طرح گر پڑا گویا تھکن کے مارے اس کا تمام جسم ٹوٹ گیا ہے اور یہ کہہ کے "ہم سو رہے ہیں" فوراً آنکھیں بند کر لیں اور سونے لگا۔ اس رات رضائی میں منہ چھپا کے، کہ کہیں وہ نہ سن لے، وہ رات بھر چپکے چپکے رویا کی

اس کے بعد، بات بات پر اس کا دل بھر آیا کرتا تھا، اور اس کا خاوند بھی اسے روتا دیکھتا تھا، اور اس کے رونے پر اپنی وحشت اور گھبراہٹ ظاہر کرتا تھا، لیکن اخلاق کا بھی استعمال کیا کرتا تھا کہ اس وحشت کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ کسی بلی کی طرح جو اپنے جسم کو اکڑا کر اپنے مالک سے ملاتی ہے، لیکن ذرا سی تکلیف پر پنجہ مارنے کے لئے تیار رہتی ہے، وہ اس سے کہتا "دیکھو روؤ مت! میری جان پہلے کی طرح مجھے چاہتی ہو نا؟ آنکھیں پونچھ ڈالو، ذرا آنکھوں سے آنکھیں تو ملاؤ۔ جان ذرا ہنس تو دو" پھر ذرا سی دیر میں بلی کی طرح نرم پنجوں میں سے تیز ناخن نکالتا یعنی کہتا "بس اب رونا بہت ہو گیا! اپنے آنسوؤں کو بند کرو! گھر کیا ہے ماتم بارہ ہے۔ تم مجھے بالکل گھر سے نکال دو گی" یہ بات کیسی سنگین تھی؟ سخت کنوارپن! بالپن کو پیچھے چھوڑتے ہوئے صرف کچھ ہی مہینے ہوئے تھے۔ کچھ مہینے میں اس بیچاری عورت ہوا! عورت کو رونے کے لئے کس قدر کافی وقت مل گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ شوہر کو اس سے سیر ہونے، اور ان کلمات کے کہنے کا بھی وقت مل گیا تھا

ہائے وہ امیدیں! وہ کس طرح منقطع ہو گئیں! رہا سہا رشتۂ قلب اس کے اس آخری فقرہ نے "تم مجھے بالکل گھر سے نکال دو گی" توڑ دیا۔ گویا وہ پہلے ہی اسے سٹی گھر سے نکلا ہوا سمجھتا ہے، کہ یہ رونا "بالکل" گھر سے نکال دیگا! اس کے بعد، اس نے اس کے سامنے

طبیعت کو روکنا شروع کیا، کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے، لیکن وہ نہایت کوشش کرکے، پلکوں کو دبا کے، ان آنسوؤں کو نکلنے دیتی، ایک دن، وہ اُس کے سامنے بھی طبیعت کو نہ روک سکی

وہ وہ دن تھا، کہ اُس نے اسے خبر دی تھی کہ وہ اُس سے اعلیٰ ہدیہ کو جو عورت اپنے خاوند کو پیش کر سکتی ہے، اُٹھائے ہوئے ہے اور کچھ دنوں میں پیش کریگی۔ اس خبر کو دیتے وقت، وہ سمجھتی تھی کہ مارے خوشی کے اچھل پڑیگا، اُس کے گلے سے لپٹ جائیگا، مگر وہ پتھر کی مورت کی طرح وہیں کا وہیں رہ گیا، متحیر آنکھوں سے یوں دیکھنے لگا، گویا سمجھا نہیں، پھر کہنے لگا، "مگر بہت جلد!" "ماں بننے کی خوشی کی خبر پر پہلا کلمہ جو اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا۔ حالانکہ عملاً اُس کا خاوند بُرا آدمی نہ تھا، اس کا دل گواہی دیتا تھا، کہ وہ بُرا آدمی نہیں ہے، سخت دل نہیں ہے، پھر وہ اس قسم کے فقرے کیوں کہے جاتے ہیں؟ کیوں اُسے رُلانا چاہتا ہے، کیا اُن کے درمیان کوئی راز ہے، کوئی غلط فہمی ہے؟

"بہت جلد!" اس طعن پر وہ اپنی طبیعت کو نہ روک سکی، اور رو پڑی، اس خیال سے متعذب ہو کر رو پڑی، کہ لوا تنک میں لپیٹے تمکن اس سے نہ چھوٹ سکی، لیکن اس رات، وہ اس رونے پر غصہ نہ ہوا، بلکہ اپنے فقرے کے اثر کو گھٹانے کی کوشش کرتا رہا "میں تو مذاق کرتا تھا، تم اسے سچ ہی سمجھ گئیں، کہیں مذاق سے بھی انسان اس قدر صابر ہوا کرتا ہے، واہ واہ واہ!" علاوہ ازیں ہنس کے جو کہا تھا، نہایت خیال کر کے کہا "ذرا سوچو تو، اگر لڑکی پیدا ہوئی، تو دس پندرہ برس کے بعد تم اور وہ دو بہنیں معلوم ہونگی"، اور یہ کہہ کے، اور اُس کے گیسوؤں میں انگلیاں ڈال کے، اور بالوں کو چوم چوم کے، وہ گویا اس سے معافی مانگتا تھا۔ اُس نے اسے معاف کر دیا۔ وہ ہمیشہ ہی معاف کر دیا کرتی تھی۔ ہمیشہ، ان نشتر زخموں کو جو اس غیر معنی شے، اس راز، اس غلط فہمی سے پیدا ہوا کرتی تھیں وہ معاف کر دیا کرتی تھی

لڑکی پیدا ہوئی، اور اس واقعے نے ایک بڑی تبدیلی کر دی۔ اُسے اپنے خاوند کو بچی کے پلنگ کے سرہانے روتا ہوا دیکھا۔ اسی کھلی حرکات برداشت کا روا رکھا۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُس نے خاوند کو روتے ہوئے دیکھا۔ یہ آنسو گویا، اس بیچاری کے سال بھر کے اضطرابات کو دھو رہے تھے، مٹا رہے تھے

اس کے اور اُس کے حال میں اچھی گذر رہی، ناسازگاری یہ ہو کہ سال بھر تک جن باتوں کی وہ عادی ہو گئی تھی، اب انکی عادت پڑ گئی تھی، اور اس لئے اب دوستوں کی محفلوں میں سر پر بہت دیر سوچا [illegible] اس کی توجہ کو اپنی طرف مائل نہ کر سکے، یہاں تک کہ دونوں، اور آخر میں آہستہ آہستہ توازن پیدا ہونے لگا، پھر بھی اُس کے دل میں کچھ نہ پیدا ہوا

اب، آخر کار وہ عظیم واقعہ اس کا خیال اُس کی آنکھوں کے سامنے، اُس کے خاوند کے غصناک چہرے، اور آتش فشاں اور جگر سوز نظروں کی تصویر لا کے کھڑا کر دیتا ہے، اور یہ غضب اور یہ آتش فشانی کس لئے ہوئی تھی؟ محض ایک چھوٹی سی بات پر، مگر لڑائی کے لئے ایک بہانہ تھا، اور اُس وقت وہ پاگلوں کی طرح ہذیان بکنے لگا تھا

نسوانی غرور، اس واقعہ کو یاد کرنے وقت، خیال میں بھی پورا نہیں کر لی۔ اس کا غرور نسوانی، اُس واقعہ کا خیال آتے ہی، اُسے پُر قہر کر دیتا ہے، اور اس لئے کہ وہ مارے غصے کے کانپنے لگے، وہ اس واقعہ کی یاد کو یوں ہی ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔

یہ وہ واقعہ تھا کہ اُس پر اُس نے بھی کھلم کھلا اپنے خاوند سے اعلان جنگ کر دیا تھا اور اسکی ناسزا باتوں کا ناسزا باتوں سے جواب دیا تھا۔ یہ لڑائی برسوں رہی

اس زمانہ میں، ایسے ایسے دن بھی آتے تھے، کہ وہ کئی کئی دن تک گھر نہ آتا تھا، ایسی راتیں بھی آئی تھیں، کہ وہ دونوں ایک بستر میں لیٹے ہوئے تھے مگر دو دشمنوں کی صورت سے لیٹے ہوتے تھے، دونوں موہنہ پھلائے ہوئے دونوں ایک دوسرے سے موہنہ پھیرے ہوئے، دونوں نہیں بات چیت سے اعرضیکہ

اس زمانے میں دونوں دشمن تھے، لیکن، پھر بھی نوجوان عورت اسے اچھی طرح جانتی تھی، کہ بس بُرے زمانے میں وہ اس کی سخت دشمن تھی، اُسی زمانے میں اُس کی محبت دل میں بیٹھی ہوئی تھی، اور اس سے بھی واقف تھی کہ وہ اُس زمانے میں اس کی تحقیر کرتا تھا اسے ستاتا تھا تاہم وہ اسے چاہتا تھا، اس کا اسیرِ محبت تھا۔

جب کیفیت یہ تھی، تو یہ دونوں زندگی کیوں؟ کیوں وہ دونوں کسی طرح خوش زندگی بسر کر سکتے تھے؟ کیوں ان میں یہ کشمکش یہ لڑائی رہتی تھی؟ وہ اس سے نفرت کرنے کی کوشش کرتی، اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بالعکس وہ اپنے تئیں اس کی طرف مائل پاتی تھی۔ اگر وہ یہ مان لیتی کہ یہ آدمی بُرا ہے تو غالباً وہ اس سے نفرت کر سکتی۔ اگر وہ حقیقتاً بُرے دل کا آدمی تھا، تو ہر لڑائی ہر جھگڑے کے بعد ندامت کے ساتھ آتا اور اپنے ہاتھوں میں اس کا منہ لے کر چومتا، اور نسل کو گڑگڑا کے بہلانے کی کوشش کرتا اور ہر طریقہ سے صلح کرنے کی کوشش کرتا کیا [illegible] رکھا تھا

اسی بڑی لڑائی کے بعد جو اسی مدت تک رہی، لڑکی نے جیسا کہ لکھنے پر یہ یہی ہوا تھا، بچی کے ہونے اور درد لے جھڑنے پر جو گھر میں ایک بڑے اندیشہ سے نجات پانے پر خوشی پھیلی ہوئی تھی؛ اس خوشی نے شوہر کو آخر کار اپنی بیوی کے آغوش میں گر کر معافی مانگنے پر مجبور نہ کیا تھا؟

اگر وہ اعتبار کرنے والی نہ ہوتا تو بھلا یہ ہو سکتا تھا؟ اُس کی یگانہ تسلی اُسکے شوہر کی محبت تھی جس سے اُسے دونوں کو، لڑائی کے دنوں کو بھلانے والی مسرت بخش صورت تھی وہ کبھی یہ گمان نہ کرتی تھی، کہ ان واقعات کے ساتھ ان واقعات کے باوجود بھی بیوفائی ہو سکتی ہے۔

ہاں اُس نے کبھی اسے سوچا بھی نہ تھا، یا یہ کہنا چاہیئے کہ سوچنا چاہتی نہ تھا اسے بیوفائی سے پاک، معرا دیکھنے کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ بیوفائی کے شبہ دلانے والی چیزوں کو بھی خاص کوشش کرکے ذہن سے نکال دیا کرتی تھی

اس نوجوان عورت نے غور سے دیکھنے کے لئے آنکھوں کو کھول کے دیوار پر سامنے میں لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھتی ہے، اور ایک ناامیدی کے لہجہ میں کہتی ہے "آہ! اب امید بھی جھوٹی ہے!" اس کی پریشان آنکھیں تصویر کو دیکھ دیکھ کر اس پر سوالیہ نشان "تو کیا ہو جاتا ہے؟" اگر ... قاعدہ گھٹنوں پر سے فرش پر گر پڑا تھا

بچی نے اس ہی مطمئن ہو کر گویا یہ خوب اچھی طرح سبق یاد کر لیا، اپنے ننھے بازو پر سر رکھ کے گویا بڑے فرض سے فارغ ہو کر آرام سے سونا شروع کر دیا۔ گھڑی پھر ایک تڑ تڑ گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ بجی دس بجے

اب بھی نہیں آئے گا اگر اب، ہاں اس دفعہ وہ نہ آئے گا سا جانتی تھی۔ راتوں کو بیٹھ کے گھڑیوں انتظار کرتی تھی، اور دوستوں کی صحبت میں دیر ہو جانے کا خیال کر کے اپنے دل کو دھوکا دے لیا کرتی تھی، آج کی رات اپنے دل کو اس دھوکا دینے، اس طرح تسلی دینے کا موقع نہیں، اس جھوٹی تسلی کو بھی ایک قاعدہ کے ٹکڑے نے آکر اس سے چھین لیا

سڑک پر سے ایک گاڑی کے گذرنے نے گھر کی کھڑکیوں کو ہلایا، بیچاری عورت نے بڑی امید سے جھلملی میں سے سڑک پر نظر ڈالی، شاید اس گاڑی میں وہ ہو مگر کوچوان نے گھوڑوں کو چابک ماری اور گاڑی تیزی کے ساتھ گذر رہی چلی گئی

اس وقت عورت ناامیدی اور غصے سے کانپنے لگی، قاعدہ کو زمین سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور سوتی بچی کی کلائی پکڑ کر کہنا شروع کیا: "نہیں آئیں گے، تمہارے ابا جان ابھی نہیں آئیں گے" لڑکی نے آنکھ کھول کر حیرت سے ماں کا منہ تکنا شروع کیا، دیکھا کہ چہرہ اس قدر پریشان ہے، آنکھیں اس قدر جل رہی ہیں کہ وہ ڈر گئی، ادھر کلائی کے دبنے سے، اور اس کے چھڑانے کی کوشش کرنے سے اس کے ہونٹ بگڑ گئے آخر اپنی ماں کی حالت، اور کلائی کے دبنے کی تکلیف سے وحشت زدہ ہو کر اس نے رونا

شروع کردیا۔ اس وقت تو جوان عورت بھی ان آنسوؤں کو جنہیں وہ گھنٹوں سے روکے ہوئے تھی نہ روک
سکی، اور بچی کو گود میں لیکر اور اپنے سینے سے بھینچکر اس نے بھی سیل اشک جاری کردیا، اور اس طرح ماں اور بیٹی
ہلک ہلک کر ماں بیٹی جانے کب بیٹھے بیٹھے سو گئیں، اپنے شوہر اور باپ کی عداوت پر رو رہی تھیں۔

پہلی رات ہے کہ وہ اکیلی بھی لیکر، اور راتوں کو، ایک واعظ نفس کے ساتھ اس تنہائی کو کاٹ
دیتی تھی، کیونکہ اسنے دل کو اس خیال سے تسلی دیا کرلی تھی، کہ باوجود چڑچڑے مزاج ہونے کے وہ میرا
معشوق، میرا دلبر ہے، اور اب بھی آئیگا تو میرا مجبور، میرا عاشق ہوکر واپس آئیگا لیکن آج وہ تسلی
کہاں، لڑکی کی ہچکی بند ہوگئی تو اُسے ہوش آیا، اور اُسنے اپنی طبیعت یکسو کرکے، لڑکی کو تھپکا تھپکا کے سلانا
چاہا۔ لڑکی سوگئی، اور اس کے دماغ میں اس کا عہد کے واقعات نے پھر آکر جمع ہونا شروع کردیا اب ایک عزم
صمیم اسکے ساتھ وہ ایک کام کرنا چاہتی تھی، ان خوفناک حقیقت کے کھلنے کے بعد، وہ البینر کو اس
سے وہ ایک علاج ڈھونڈنا چاہتی تھی جو اس قسم کی زندگی سے جسے بسر کرنا ممکن نہ تھا اسے رہائی دے
اور پھر اس کی پہلی پر لطف پرمحبت زندگی واپس لے دے۔ اور یہ کام اس صنف لطیف نازک کے ذریعہ سے
کرنا چاہتی تھی جو اتنے ہفتہ دنوں تک ہمیشہ مغلوب ہی رہا تھا

اس بات کا اُسے پورا یقین تھا کہ اُس کے دل میں ایک پاک محبت ہے وہ اسے بھی جانتی تھی،
کہ کل ماضی ہے اس خوفناک حقیقت کے ایک دھبہ ہے جو دھل سکتا ہے محو ہوسکتا ہے، اور بیچاری دکھی
کمائی عورت چاہتی تھی کہ اس خوفناک واقعہ کو بھی عفو کردے یا جیسا وہ اور واقعوں کو عفو کرچکی تھی لیکن
اسے بھول جانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ شوہر تمام اس کا صرف اُس کا ہوجائے

اب لڑکی کو تھپکاتے وقت کہہ رہی تھی "آہ او وہ عورت، تو یوں کہنا چاہتی ہے کہ بہت فاودیہ پر مجھ
اول اُسے تصرف کیا، یوں کہنا چاہیئے کہ میرا خاوند مجھ سے زیادہ اُس سے معلوم ہے" اس کا جو صلہ
اسے قبول نہ کرتا تھا وہ گذشتہ چھ برس کی زندگی، جو باوجود اپنی تمام مصیبتوں کے، آج کی رات کے مقابلہ

میں گویا پُر راست زندگی تھی؛ اس کُل زندگی میں وہ عورت شریک تھی۔ اس زندگی کا ایک حصہ، سارا بہتر حصہ، یقیناً بہتر حصہ، ایک بیوہ کے نصیب ہوا

وہ پیار جو اُس کے لئے ہونا چاہیئے تھا، مگر نہیں ہوا، وہ بوسے جو اسے ملنے چاہیئے تھے، مگر نہیں ملے، وہ دوسرے کو دے گئے! ہاں، ہاں وہ جو ایک ان بوسوں میں، ہاں ان بوسوں کے درمیاں اُسے ایک زہر کا گھونٹ چکھا تھا وہ اس بیوہ کے ناپاک منہ کا بچا ہوا ایک قطرہ تھا۔ یہ خیال کرتے ہی اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خود بھی ناپاک ہوگئی؛ اور خود اپنے سے اسے نفرت ہونے لگی۔ اس آدمی نے اس شوہر نے کیا کیا یہ کیا؟ اس کے بستر سے نکل کے اس کے بستر میں آیا! ان ہونٹوں سے جو اس کے منہ چھوتے سے تر اور ناپاک تھے، اس کا ایک بوسہ لیکر، گویا ایک بوسہ صدقہ کرکے اِس کا منہ ناپاک کرنا! اُس کی رائحہ جان سے مست اور مدہوش ہو کر اس کے پاس آنا، اور اس کے بالوں میں سر ڈال کے مشام جاں سے، اسی کو سونگھنا اس کے بازو پر سر رکھ کے سوتے وقت، خواب میں اُس کے ساتھ ایک نا تمام بیتے ہوئے جلسہ عاشقانہ کو دیکھنا! آہ اس آدمی نے اِس صاف و پاک نوجوان عورت کو، ایک بیوہ کا شریک بستر کرکے ملوث کر دیا تھا!

یا اللہ کیوں وہ ایسا کرتا تھا؟ اگر حقیقت میں اُسے نہ چاہتا تھا تو پھر، ملے تو بھی، یہ اعمال کیوں؟ یہ ایک خطائے موعود! ایک قصائے عقلت بھی نہ تھی۔ اسے اس طرح برسوں سے دھوکا دے رہا ہے، برسوں سے بے وفائی، خیانت کر رہا ہے۔ اور یہ بھی؟ اس بیوہ کے عشق پر صرف وہی نہیں، بلکہ یہ بچہ تھا، فرشتہ بھی قربان کیا جا رہا ہے۔

یہ بچی بھی زور لپٹنے ابا کے آنے کا انتظار کرتی ہے، اور نہ آنے کا سبب نہیں جانتی۔ وہ پیار جو اس معصوم کا حصہ تھا، وہ اُسے نہیں ملتا۔ ایک معصوم کا حق بھی غصب ہو رہا ہے۔ اس غصب پر کیوں اُس نے کمر باندھ رکھی ہے۔

نہیں، نہیں، یہ حالت نہ رہنا چاہیئے، نہ رہنے دی جائیگی، نہ رہیگی، ایک علاج ایک تدبیر
جو ان تمام باتوں کو مٹا دیوے، ان تمام باتوں کو ایک بُری خواب کی یاد کی طرح چھوڑ جائے آہ کوئی تدبیر
سوجھے، کوئی ایسی تدبیر کہ کارگر ہو۔

اس کے بعد، پھر اس کے بدن سے، یاس اور فکر کی وجہ سے طوفان اضطراب اُٹھا، اور بسمل اشک
بہانے لگا، اُسے اسی بیت بہی تھی کہ اسی لڑکی پر لپٹ ڈالے، رومال میں منہ چھپا کے آہستہ آہستہ رونے لگی
دوسرے دن صبح اُٹھی اور تدبیر کو سوچتے ہوئے اُٹھی اور اس تدبیر کو عمل میں لانیکا پورا ارادہ کئے ہوئے
اُٹھی گو آج تک کسی نامحرم عورت سے یہ نہیں کیا مگر وہ کریگی، اس خارق العادہ کام کو کریگی یعنی جاکر اس بیوا
کی منت کریگی اور اس کا خاوند سے واپس دینے کی التجا کریگی اس کا پتہ اس میں مفصل تحریر تھا، ''چوک کی بڑی سڑک
میں داہنے طرف حلوائی کی دوکان کی بازو سے جو گلی پھٹتی ہے، اس میں جو تھا مکان، پیتل کے سروں والے کواڑ کا
دروازہ '' ہاہا۔ اس بڑی مصیبت میں اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے والی'' تحقیق کرآئی تھی

(۳)

وہ آج کی صبح ابھی پوری بیدار بھی نہ ہوئی تھی، آنکھوں میں رات بھر دیر تک جاگنے سے خموری
چھائی ہوئی تھی، وہ طفلک جو اس زمرہ کے متوسلین میں سے ہے، اپنے اپنے گھر چلی گئی تھی، یا زیادہ صحیح یہ کہ ابھی
گھر سے واپس نہیں آئی تھی، اُس کی گرگ باراں دیدہ ماں بھی کسی کام سے باہر تھی، صرف ایک خدمتگارنی گھر میں
موجود تھی

خدمتگارنی نے اوپر جاکر سونے کے کمرے کا کواڑ آدھا کھول کے کہا "ایک بی بی برقع اوڑھے آئی ہیں
اور آپ سے ملنے کے لئے اصرار کر رہی ہیں" اس خبر پر اُسے بہت حیرت ہوئی اُس نے، آہستہ سے تاکہ کہیں
وہ جو پہلو میں سو رہا تھا جاگ نہ اُٹھے، کہا، "برقع والی بی بی! مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟"
اُسے یقین نہ آتا تھا، برقع والیاں بھی اُس سے ملنے آنے لگیں! اب تک تو کوئی برقع والی اُس کے ہاں

آئی تھی پریشاں بالوں کو جلدی جلدی سلجھاتے ہوئے، آنکھوں کو ملتے ہوئے رومال سے موہنہ پونچھتے ہوئے کیونکہ
موہنہ دھونے کا وقت نہ تھا، الجھے دوپٹے کو جھٹک کر ایک سا کیا ہوا دوپٹہ اوڑھتے وقت اس نے دھڑکتے دل
پر ایک ستے کی نظر ڈالی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب تک یقین نہیں کر رہی کہ حقیقتاً کوئی گھروالی بی بی اُس کے
پاس آئی ہے، ڈالی کمرے میں سے نکلوں کے بل چل سکے وہ ٹھیک سے کمرے میں اُس کمرے میں جس سے
رنج والی بی بی اسکا ... دیکھی تھی آئی دیکھا حقیقتاً ایک رنج والی بیٹھی تھی بیٹھی تھی، غلط قلم سے نکل
گیا، اس گھر میں بیٹھ کر وہ اپنے کو ناپاک کرنا چاہتی تھی اگرچہ اُسے اس کمرے، کالا گھونٹے والی ہوا میں
سانس لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اہم باؤں کے سوا اور کوئی عضو بدن کی حسرت دل کو نہ چھو سکیگا۔

اُس نے اُس کی پذیرائی کے لیئے، بالوں کو درست سلجھانے، دوپٹے کو آہڑ پنے سے نہیں، بلکہ باقاعدہ
اوڑھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اسکے بعد آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی نوجوان عورت نے سوا ایک
ہیکل ہیبت عدالت سی کھڑی تھی۔ اس وقت رخ اُٹھایا، اور آسمان سے اُترنے والی ایک نگاہ عصمت نے
اس بیسوا کو جس نے اُس کی زندگی کی خوشی کو برباد کر دیا تھا دیکھا

"باوقار عورت جس کی ہر سانس، ہر نظر، ہر حرکت سے باعصمت بی بی اور ماں ہونے کی قدسی اور
علوی صفت ظاہر ہو رہی تھی، اس بیسوا کے مقابلہ میں کھڑی ہو کر اُس کی زندگی کی ذلت کو اور بڑھا رہی
تھی وہ اس بات سے متاثر ہو کر پوچھنے لگی

"آپ مجھے چاہتی تھیں، بیگم صاحب؟"

اُس نے آنکھوں سے سراسر برسا کے، بلا تردد جواب دیا،

"ہاں تمہارے پاس تو نہ، برسوں سے مجھ سے چھپتے ہوئے خاوند کے لئے آئی ہوں" اُس آواز میں ایک
عزم آہنیں کی قوت، ایک حاکم عدالت کی مہابت موجود تھی اور بیسوا فوراً سمجھ گئی اور اپنے دل میں کہنے لگی
"او ہو، یہ اُن کی بیوی ہیں، لیکن بیسوا ہے، ہرگز نہ ڈریں" اب یہ دونوں عورتیں ۔ بیر جھٹ پہلے عورتیں

تھیں ۔ تیز نگاہوں سے ایک دوسرے کا معائنہ کر رہی تھیں
اوہر والی نے ایک نگاہ میں دیکھ لیا کہ اس عورت میں جو یہ خاوند مانگنے آئی ہے ایک حسن تھا جو
اس صف میں نہیں نظر آتا جس سے کہ وہ خود منسوب تھی ایک علوی حسن تھا جو صرف عصمت دار عورتوں کے ساتھ
مخصوص ہے

ایسی آواز سے جس سے ایک ادائے استہزا ظاہر ہوتی تھی اُس نے جواب دیا "شوہر کو مجھ سے چاہتی
ہو مگر بی بی جان آپ غلطی پر ہیں، میں نے کسی کے شوہر کو ضبط نہیں کر لیا"

وہ اس جواب کی پہلے ہی سے متوقع تھی، اس کے سنتے ہی اُس نے بات بڑھا دیا "آخر اس کی کیا ضرورت
ہے؟ جھوٹ بولنے کی کوئی حاجت نہیں۔ میں تم سے یہاں لڑائی لڑنے نہیں آئی ہوں یقین مانو تم سے بیر رکھنے کا
بھی میں اپنے میں کوئی حق نہیں دیکھتی میں جو آئی ہوں تو اسلئے کہ اب بھی شاید تمہارے دل میں وہ چیز
باقی ہو جو ہم سب کا حصہ ہے میں تمہیں رحم کا نہیں تو پریم کا واسطہ دیتی ہوں سمجھی ہو میں کیا کہنا
چاہتی ہوں؟ میں تم سے اپنا خاوند چھیننے نہیں آئی کیونکہ اپنے میں اس کی یہ حالت نہ طاقت پاتی ہوں
میں اسے مانگنے آئی ہوں تمہاری ہتھیلی میں اس وقت ایک بہت بڑی چیز ہے، ایک گھر کا چین، ایک
خاندان کا آرام، تمہاری ہتھیلی میں ہے اُسے چاہے مسل دو، چاہے چھوڑ دو۔ ان آنکھوں کو جو چھ برس
کے رونے سے تر ہو رہی ہیں تم سکھا سکتی ہو۔ اُس سے تمہارا علاقہ کیا ہے کس طرح شروع ہوا
اب کس رنگ میں ہے۔ میں اس کا کھوج نہیں لگانا چاہتی ۔ چاہتی ہوں کہ وہ اس وقت مجھ سے
زیادہ تمہارا ہے مجھ سے بھاگ کے تمہارے پاس آتا ہے۔ حالانکہ وہ میرا شوہر ہے اُسے صرف میرا
ہو کے رہنا چاہئے میرے سوا اس پر کسی کا حق نہیں ہے میرے سوا وہ کسی کی ملکیت نہیں، کسی کی
امانت نہیں۔ تم عورت ذات ہو تم عورت کے دل کی باتیں شاید سمجھ سکتی ہوگی؟ سمجھی ہو نا؟ تم نے کہیں
سمجھو کہ میرا شوہر لیکر مجھ سے کیا کما لے لیا گھر بھر کا امن، گھر بھر کا چین لے لیا وہ کل رات اور بہت سی

راتوں کی طرح یہاں تھا، اُسے ساری رات شاید کیا یقیناً تمہارے ہاں گزاری، شاید تم مجھ سے ملنے اس
کمرے میں آئیں، تو اس کے پہلو سے اُٹھ کے آئیں۔ لیکن جانتی ہو کہ اُنہیں کی بیوی نے یہ رات کیونکر کاٹی،
یہی رات نہیں، اسی طرح کی اور سینکڑوں، اس کس طرح کاٹیں جہنم میں انگاروں پہ لوٹ لوٹ کر کاٹیں
میری پانچ برس کی لڑکی۔ ہاں سچی، ہوا میرے پاس پانچ برس کی ایک بھی بھولی بھالی بھی ہے۔ وہ بھی رو رو کے
بابا کا انتظار کر کے سوئی ہے۔ البتہ تمہیں خبر نہیں، کہ گھر میں یہ کیفیت کسی مصیبت کی کیفیت ہے اگر تم
جانتی ہوتیں تو تم ضرور اس سے کہتیں: "جاؤ میرے پاس سے جاؤ تمہارے گھر میں جو عورت تمہارا انتظار
کر رہی ہے، جو بچی تمہارا انتظار کر رہی ہے اُس کے پاس جاؤ۔ میں اُن کے دکھنے کا سبب نہیں ہونا چاہتی"
خواب، وہ، تمہاری آنکھوں کا بیچا ہوا ہی کافی خواب ہے ہم جس زندگی کا ٹھٹے پر مجبور ہوں، شاید
اُس زندگی نے بھی تمہاری طبیعت کو بالکل مسخ نہ کر دیا ہوگا کیونکہ تم عورت ہو، اور عورت سے عورت نہیں
کب جا سکتا ہے ہر عورت کی طبیعت بیوی نیز ماں بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے مجھے یہاں تک لانے والی
تمہاری خوشامد کرانے والی چیز یعنی بچے کی محبت شاید تم میں بھی ہو"

یہ کہتے کہتے اس پر رقت طاری ہونے لگی، اور وہ یہ بھول گئی کہ وہ ایک فاحشہ کے مقابلہ
میں ہے، اور طبیعت پر قابو میں ذرا سی کمی آنے لگی، آواز میں باوجود بے انتہا ضبط کے کچھ تھرتھراہٹ
پیدا ہو گئی، ڈھیرے دل میں چشمے کی طرح اُبل رہے تھے، وہ کم کہنا چاہتی تھی، مگر زیادہ کہہ رہی تھی اُدھر
والی، اس پرجوش، پُرخروش دلی تقریر کے سامنے چپ کھڑی تھی، اور نہیں جانتی تھی کہ کیا جواب دے،
کبھی کبھی "لیکن میں" "مگر وہ" سے کچھ فقرہ شروع کرنا چاہتی، مگر اس نیک بیوی کے مقابلہ میں جو اُس کے
سامنے اپنے تمام جذبات زندگی کے ساتھ فریاد کر رہی تھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی

ایک دم، نہ معلوم اس کے نفس پر گراں گزری اس عورت کے سامنے اپنے ایسے مقابلہ
سے عاجز دیکھ کر، اس عصمت کے حضور میں اپنی ذات محض کو ذلیل محسوس کر کے، اُس کے دل میں ایک

طغیان عود اٹھا، راس [illegible] میں جس پر ورا کی دراکو عورت پن کی ماسا رحم داد، رقت پیدا ہوئی

پوچھا کہ [illegible] واسطے والے اور [illegible] اس [illegible] اس کے ملو ستے اگر اس [illegible] اس آدمی

کی [illegible] معلوم ہوتی تھی [illegible] آمد [illegible] کا ارادہ کر لیا اور کہا

"ماں اسد آپکی برائی باہم نہیں مجھ سے آکر ناجائز مداخلت کی ہو، اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو اسے پکڑ کے رکھیے، اشاکر سے رکھنے کی ندامت گوارا نہیں ہوتی"

نوجوان عورت نے دیکھا کہ سامنے والی اب وہ عورت نہیں جس میں نسوانی پیدا ہو رہا تھا بلکہ اب وہ ایک عورت ہے جو ایک خاص کی عدالت سے مقصد ہو کر لڑائی لڑنا چاہتی ہے اس نے دراز آواز سے جواب دیا

"مجھ سے پہلے تمہیں اسے اپنا کر لیا تھا اسے ساتھ باندھ لیا تھا پھر کیوں پوری محافظت نہ کی کیوں اسے اجازت دی کہ وہ جا کر ایک جوان لڑکی کی زندگی تباہ کر دے نہیں اسے پکڑ کے رکھنا چاہیئے تھا، نہ اسے پکڑ کے رکھتی ہو، نہ چھوڑ دیتی ہو میں اپنے میں اس قوت نہیں پاتی وہ حیلہ نہیں جانتی کہ اسے تمہارے پنجوں سے چھڑا لوں"

ادھیڑ والی، اس کونے میں سے ایک موڑھا کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی اور پاؤں پر پاؤں رکھ کے ہلانا شروع کیا، اور ایک مسترد نظروں سے نوجوان عورت کو دیکھنے لگی ایک دو منٹ تک خاموشی طاری رہی، دونوں سوچ رہی تھیں کہ ان باتوں کا انجام کیا ہوگا کہ اتنے میں موڑھے والی نے پوچھا

"تو اب میں کیا کروں، ہر شام بیگم صاحب کے گھر، انکے شوہر کو ہاتھ پکڑ کے پہنچایا کروں؟"

اس نے اس طعنہ، اس تحقیر پر بھی صبر کیا، ایک مرتبہ پھر اس کی نیکی طبیعت اگر اس میں نیکی طبیعت رہ جانے کا احتمال باقی ہو، نے اپیل کرنے کا ارادہ کیا

"کیوں یوں تحقیر فقرے کستی ہو، میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ تم سے لڑنے نہیں آئی ہوں

میں جو ایسے مانگتی ہوں، جو ایسے امید رکھتی ہوں وہ ایک سادی سی بات ہے تم اُس آدمی کو چاہتی ہیں، یا جیسے کہوں، وہ بھی تمہارے لئے اور بہت سی آدمیوں کی طرح ایک آدمی ہے! وہ بھی انہیں سے ایک ہے جس سے تمہارے گھر کا خرچ نکلتا ہے اور بس "

اس پر یکایک وہ غصہ میں آگئی اور کہنے لگی، "میرے گھر میں آکر مجھ کو ایسی باتیں سناتی ہو میری ہتک کرتی ہو، اں،"

فاحشہ تو غصہ کے لئے ایک بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی، "باتیں سناتی ہو، میری ہتک کرتی ہو"، پر ہی اُس نے بس نہیں کیا، بلکہ اور بھی بہت کچھ کہہ ڈالا، نوجوان عورت ابتک اپنی متانت قائم رکھے تھی لیکن اب وہ بالکل سی چھوٹی جاتی تھی؛ اور وہ بھی دل میں غصہ سے کانپ رہی تھی اور اُس کا دل چاہتا تھا مگر دل کو روکتی تھی، کہ اس بےحیا عورت پر جو اپنی عادت دیرینہ کے موافق، بغیر سوچے سمجھے اپنے سینے سے دوپٹہ ہٹاتے ہوئے، اول قول بک رہی تھی حملہ کر کے مونڈھے پر سے گرا دے لیکن طبیعت پر جبر کئے ہوئے خاموش کھڑی سُن رہی تھی۔ اتنے میں دیکھا کہ خود وہ اُٹھی اور اُس سے ہاتھا پائی کرنی چاہتی ہے، اس کو دیکھکر اس کا عزم صبر بالکل جاتا رہا؛ اور اُس نے اونچی آواز سے کہا۔

"ہاں ہاں، میں تمہارے گھر میں ایسی باتیں سناتی ہوں، تمہاری ہتک کرتی ہوں، جانتی ہو جیسی عصمت والی بی بی ہوں، محبت والی ماؤں کی لعنتیں بددعائیں پڑتی ہیں تم جو گھروں کے چین کی، بی بیوں کے آرام کی دشمن ہو، تم جو ہمارے خاوندوں کو ہم سے چرا لیتی ہو "، یہ کہتی ہوئی کانپ رہی ہے، اور اپنی ذلیل زندگی کا انتقام اس فاحشہ کی تحقیر کرے، ایسی سخت سخت باتیں سامنے سے لینا چاہتی ہے اب اُدھر والی بھی مارے غصہ کے پاگل سی ہوگئی، دوپٹہ بدن سے اتار کر پھینک دیا، اور اسپر حملہ کرنے کے لئے ایک قدم آگے ڈالا، مگر صرف ایک قدم، دوسرا قدم ڈالنا چاہتی ہی تھی کہ پیچھے سے مردی ہاتھوں نے اُس کے

کندھوں کو پکڑ لیا اس وقت اِن دونوں عورتوں نے اُسے دیکھا

وہ تھوڑی دیر سے، وہاں، کواڑ کے پیچھے کھڑا اُس رہا تھا اس بس مٹ کے رہا ہے، اس پر کیسہ نفس ولصمۂ حیات کے لئے برسوں کی ریاضت کا کام دیا اول اسے اپنی نوجوان بیوی کو ۔۔۔ اُس بیوی کو جس کے آنسوؤں کے لستان اشک اُس کے رخساروں پر تھے، جس کا صرف غمگین چہرہ کھلا ہوا تھا، ماتی لبا، متناسب الاعضا، لطیف اور سترمیلا جسم برقع میں چھپا ہوا تھا ۔ دیکھا، پھر فوراً نظر اُس دوسری پر پڑی، جو بالوں کو بکھیرے، باسی ہونٹھ اور مخمور مگر بھٹی آنکھیں لئے، ململ کرتی جاور کو چڑھ گئی تھی اپنے اس جسم کو ظاہر کر رہی تھی جس کے رگ رگ سے حساب ملوث افتا ہوسے تھے، اور جس کی تمام پست کذائی سے گویا بوئے تحس کے بھپکے نکل رہے تھے، ان دونوں کو مقابل دیکھکر ان دونوں کا فرق اس کی آنکھوں میں چبھ گیا ایک پاک و لطیف، دوسری کثیف و ملوث! ہم جنساً ہم اخلاقاً ملوث!

پھر اپنی بیوی کے آواز کی رقت میں وہ ایک اداے استرحام پایا تھا جو دل کو مسلے ڈالتی تھی، اُس دوسری کی آواز میں بے انصافی، استہزا، گستاخی، جرأت چھپی ہوئی تھی جس کو اس کے وجدان نفرت کرتا تھا اور اُسے ایسا جوش آیا کہ اُسے تحقیر طمار سے گرا دے اور اس کے قدموں پر گر پڑے۔ اللہ کی پناہ! اس عورت، اس مقدس اور محترم فرشتۂ سعادت کو کس پر قربان کر رہا تھا، کس کے لئے ستا رہا تھا؟ ایک فرسودہ ملوث مخلوق کے لئے جو سیکڑوں آغوشوں میں جاکر متاع عشق اور جنس حسن بیچی تھی،

ایک منٹ میں آنسوؤں کے دریا اس کی وجہ سے بھی اس کی نظروں کے سامنے سے گذر گئے، وہ تمام بے انصافیاں جو اس سے اپنی بیاہتا کے ساتھ کی تھیں، اس کی ضمیر پر برچھی کی طرح آکر لگیں، اب قلباً اپنے تئیں اس سے کس قدر مربوط، اور اُس سے کس قدر دور پا رہا ہے!

جب یہ بات ہے، تو اسکے کونسی چیز مانع ہے؟ بس اتنا اب ایک پہلا نگ میں لپیٹ تبھی اس قعر ذلت سے نکال کر، اپنی زندگی اپنی بیوی بچوں کے لئے وقف کردیگا، اور اُس کے پاؤں پر سر رکھدے گا

یہ سوچ ہی رہا تھا، کہ دیکھا کہ فاخشہ اس کی بیوی پر ہاتھ چھوڑنا چاہتی ہے یہ دیکھتے ہی دُنیا اُس کی آنکھوں میں تاریک ہوگئی، وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ کواڑ کھول کے کمرے میں در آیا، اور اپنے آہنی ہاتھوں سے اس کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا

اور پھر ایک ذرا سا جھٹکا دے کے اسے اور اُس کے ساتھ اُس کی عصمت کو اپنے سے دور پھینک دیا، اور پھر اپنی بیوی کے پاس جا کر اُسکے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور ایک نگاہ احترام کے ساتھ جسمیں آج کے دن تک کی تمام قصوروں کے لئے طلب عفو آکر جمع ہوگئی تھی، اُس سے بھرّائی ہوئی آواز سے کہا.

،، میری خطاؤں کو معاف کردو، میں صرف تمہیں چاہتا ہوں، میں صرف تمہارا ہوں اور تمہارا ہو کے رہونگا ،،

اور پھر اُس کے چہرے کو جس پر دو آنسوؤں کے قطرے. دو قطرۂ سعادت ڈھلک آئے تھے، اپنی طرف کھینچکے، اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھدئے،

اور جبکہ وہ فاحشہ اپنے غصہ اور حسد کو ایک کھسیانی ہنسی سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، اس میاں بیوی کے جوڑے نے، جنکے درمیان اتنک ایک سرد مہری کی دیوار حائل تھی جسے وہ ہٹا نہ سکتے تھے. پاک صاف محبت بھرا بوسہ لیکر گویا دوسری مرتبہ نکاح کیا! اور وہ پیمان وفا باندھا جو اب عمر بھر تک نہ ٹوٹیگا یہ بوسہ اس پیمان وفا کی مُہر تھا

سجّاد حیدر

سارس کی تارک الوطنی

ارلستی کے وسیع میدان میں چاندنی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور دامن کوہ میں خاموش چشمہ کے کنارے ایک سارس کا جوڑا تارک الوطن ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گو ان کے دماغ (یعنی احساس انسانی کا مرکز) اس قوت سے محروم ہے جو اس قصد کے نتائج و تکالیف ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتی۔ تاہم وطن کی مفارقت کا اثر ان کے اعضاء جسمانی ان کی حرکات سکنات سے ظاہر تھا دونوں خموشی کے ساتھ کھڑے پہاڑ کی بلند چوٹیوں کو حسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے آبشار بلندی سے گر رہے تھے اور اس بھولی بھالی مخلوق کی قوت سامعہ ہوا کے ترچھے جھونکوں کی بدولت معمول سے زیادہ کام کر رہی تھی دو ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ جوڑا قدرت کی اس دلچسپی اور وطن کے در و دیوار کو غور سے دیکھتا رہا آخر چاند کی روشنی کا انحطاط سارس کی توجہ میں خلل انداز ہوا اور وہ آتش فشاں پہاڑ جو قمر چہاردہم کے اندر صاف و روشن نظر آ رہے تھے دھندلے دکھائی دینے لگے۔

زمین اپنے محور کے گرد چکر کھاتی ہوئی رات کو کنار صبح تک لے آئی شیر اور چیتے جن کی دھاڑوں نے تمام جنگل سر پر اٹھا رکھا تھا اپنے اپنے غاروں میں جانے شروع ہو گئے اور کسی خوش الحان پرندے نے تاڑ کے درخت پر سے صبح صادق کا مژدہ سنا دیا۔

ایک خاص حال میں اس قدر دیر تک متوجہ رہنے سے نر کی قوت متخیلہ کچھ زیادہ کارآمد نہ ہوئی وہ سوچ سکا کہ غربت میں کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں گی اور کیسی کیسی دقتیں اٹھانی پڑیں گی چاند کی روشنی لحظہ بلحظہ پھیکی پڑ رہی تھی سارس نے دفعتاً اپنا منہ مادہ کی طرف کیا اس کے کندھوں پر اپنی گردن رکھی اس کے کاسنی پروں کو جو حنائی مائل تھے آنکھوں سے لگایا اور اس طرح جذبات قلب پورے کر کے کہنے لگا "چل چل پیاری مادہ ایسے میں اڑ چلیں ٹھنڈے ٹھنڈے بہت دور نکل جائیں گے ورنہ مشرقی شہسوار تخت آسمان

پر جلوہ گر ہو جائے گا اور پھر تیرے تاریک اور شاید گرم ہوا کا مقابلہ آسان ہے نہ کر سکیں اُٹھ اٹھ میں موہنی مادہ چل کھڑی ہو۔ میری زندگی کی تمام خوشیاں تیرے ان چمکدار پروں میں پوشیدہ ہیں تیرا یہ حسن دلفریب میری زندگی برقرار رکھنے اور مجھ کو ہمیشہ کامیاب بنانے کے لئے کافی ہے"۔

چونکہ سارس اپنے سفر کا ارادہ اپنی ترک الوطنی کا قصد شام ہی سے ظاہر کر چکا تھا اس لئے مادہ نے اپنے گلابی مائل سُرخ رخسار قریب لاکر پہلے سچی محبت کا جواب دیا اور پھر اس طرح مخاطب ہوئی۔

مجھ کو حکم کی تعمیل میں عذر نہیں مگر کیا کروں قدرت نے میری سرشت میں یہ مادہ ودیعت کیا ہے کہ میں اس مرغزار کے پتے پتے کی جدائی جہاں میں چھوٹی سی بڑی ہوئی محسوس کروں پہاڑ کی چوٹیاں اس وقت سے میرے سامنے ہیں جب سے میری آنکھ کھلی آبشاروں کی آوازیں اس وقت سے میرے کانوں میں ہیں جب سے میں ان کو سننے کے قابل ہوئی یہ درختوں کے پتے اور کنار نہر کے خودرو پھول جو ہمیشہ سے میری آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں ان کا فراق مجھے سخت تکلیف دہ ہوگا اس پار پہنچ کر نئی زمین ہوگی نیا آسمان نیا دانہ نیا پانی مگر یہ سرزمین جس کے چپے چپے اور کونے کونے میں میرے قدم چلے ہیں مجھ سے چھوٹ جائے گی اور یہ ہوا جس نے مجھ کو تھپک تھپک کر لوریاں دی ہیں مجھ سے کوسوں دور ہو جائے گی۔ آخر مجھے معلوم تو ہو وہ کیا چیز ہے جس نے تم کو ایسا دل برداشتہ کیا کہ وطن جیسی چیز کو عمر بھر کے لئے خیرباد کہتے ہو۔

سارس میں نہیں چاہتا کہ ایسی جگہ زندگی بسر کروں جہاں ہوا اور خود غرض انسان کا گزر ہو سکے مجھے اندیشہ ہے کہ ایسی نفس پرور مخلوق کے خیالات سے متأثر ہو کر میری آیندہ نسل برباد ہو جائے گی۔

مادہ تم مجھکو اجازت دو تو میں اس قدر عرض کرنے کی جرأت کروں کہ ہمارا اس حد تک انسان سے نفرت کرنا ایک قسم کی محسن کشی ہے جو ہمارا مشغلہ نہیں دنیا بالکل اُجاڑ ہوتی ہم ہی جیسے کاشت کرنے والے چاروں طرف آباد ہوئے کاشت کی کل ہستی یہ ہوتی کہ لنگوروں کی چھلانگیں چیلوں کی چیل چل ہرن چیکارے بارہ سنگے سانپ مچھلی کنکھجورے بچھوے وغیرہ وغیرہ۔

قدرت کو ضرورت تھی ایک ایسی مخلوق کی جو نظام عالم کی داد دے اور صنعت دنیا کو دیکھ کر صانع حقیقی کے کمال کا اعتراف کرے پس انسان کی خلقت ضرورت ہے قدرت کی اور یہ اسی مخلوق کا کام تھا کہ اپنی محنت اور عقل کی بدولت پہاڑوں سے چشمے بہا دیئے اور آسمان پر بے پر وبال اس طرح پہنچا کہ چاند تاروں تک کی حقیقت معلوم کر لی کیا آپ کو اس سے انکار ہے کہ یہ طرح طرح کے میوے یہ ہرے بھرے کھیت یہ لہلہاتے ہوئے درخت جن سے ہمارے گردوپیش کی رونق مالامال ہے ہم کو محض انسان کی سعی سے میسر ہوئے ورنہ پہاڑوں کے سنگریزے ہماری خوراک ہوتی اور کوہ آتش فشاں کا کھولتا ہوا پانی۔

ایسی اچھی اور کار آمد مخلوق جس کی محنت سے ہم ہر طرح مستفید ہوں اس قدر تعریف کی مستوجب نہیں؟

سارس۔ مگر انسان جیسی دغاباز شے جو تیری نگاہ میں اشرف اور میری رائے میں ارذل ہے ہرگز پسند کرنے کے قابل نہیں اس کی سرشت میں دھوکا اس کی طینت میں دغا اور اس کی گھٹی میں خود غرضی پڑی ہوئی ہے۔ افسوس ہے صبح ہی صبح ایک نہایت منحوس چیز کا نام لیا انسان ؟ کیسا انسان دغاباز مکار جس کی ہمت جھوٹی جس کی باتیں بناوٹی جس کا دل ظلمت کدہ سچا احساس اس سے کوسوں دور اور اچھے خیال اس سے میلوں پرے دیکھ وہ سورج کی کرنیں پہاڑ کی چوٹیوں پر پڑنے لگیں اب ہمارا یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ افسوس آج کا سفر ملتوی ہوا چل پہاڑ پر چل اور حیات انسانی کی کیفیت مجھ سے سن"۔

آٹھ دس برس کا عرصہ ہوا میں بچہ ہی سا تھا ایک رات جبکہ چاندنی چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی میرے باپ نے باہر نکل کر دیکھا درختوں کے پتوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایک نور سا برس رہا تھا پیاری بی بی تجھے کبھی پردیس جانے کا اتفاق نہیں ہوا اگر رستہ میں میرا قدیمی مکان پڑا تو میں تجھے دکھاؤں گا کہ وہ کیسا پرفضا مقام ہے۔ دامن کوہ سے چشموں کا اترا اترا کر اور مچل مچل کر چلنا تجھ کو بتا دے گا۔ کہ فطرت نے میری پرورش کے واسطے کیسی دلفریب اور دلچسپ جگہ انتخاب کی تھی ہاں تو شب ماہ اپنا بناؤ سنگھار کئے ہر دو دنیا پر جلوہ گر تھی والد مرحوم کا دل سیر کو چاہا مجھے اور میری ماں کو ساتھ لیا اور ہم تینوں ہوا میں اڑے تاروں

ساحل ملک کو جیسے عروس سا رکھا تھا ہم کو کسی خاص جگہ پر جانا مقصود نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں نے پورب کی طرف دھکیل دیا اور ہم چاندنی کا لطف اٹھاتے اسی طرف روانہ ہوگئے ؛

رات اٹھلا اٹھلا کے اپنا رستہ طے کر رہی تھی ہم جزیرہ ارسیوا میں پہنچے تو ہمارا گذر قصر سلطانی پر ہوا دیکھتے کیا ہیں کہ شہزادہ الیاس بھی ہماری طرح شب ماہ کا لطف اٹھا رہا ہے اور اس کی معشوقہ برابر میں بیٹھی ٹھنک ٹھنک کر باتیں کر رہی ہے۔ الیاس ٹکٹکی باندھے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کچھ عجب قسم کی محبت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی چونکہ محبت کا وہ مادہ ہمارے دماغ اور خیال سے ارفع و اعلیٰ ہے میں اس کی صراحت سے مجبور ہوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی کی ایک ایک ادا الیاس کا کلیجہ مجروح کر رہی ہے وہ دیوانہ وار شہزادی پر نثار ہو رہا تھا کبھی اس کے نازک ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھتا تھا کبھی آراستہ و پیراستہ زلف کو سونگھ کر جھومتا کچھ دیر تک تو اس طرح قلب مضطرب کو تسکین دی اور پھر بیتاب ہو کر کہنے لگا

"سلطنت کا لطف بھی اسی وقت تک ہے جب تک کہ تو میری آنکھوں کے سامنے ہو ورنہ شہزادی تمام سامان عیش ہیچ ہے لاؤ گل اندام اپنے پیارے ہاتھوں سے ایک جام دے "؛

شاید عورت کی فطرت ہی میں یہ داخل ہو گا کہ شہزادی الیاس کو اس قدر والہ و شیدا دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئی اس کے حسن کی چمک پہلے سے دوچند ہوگئی گلاب سے رخساروں میں سرخی جھلکنے لگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی چاہتی تھی کہ آگے بڑھ کر شیشہ و ساغر اٹھائے الیاس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا

ان ہاتھوں کو اس قسم کی تکلیف دینا منشاء قدرت کے خلاف ہے یہ کہہ کر شہزادہ الیاس نے جام بلوریں آگے رکھا شہزادی ساغر تیار کر رہی تھی کہ اتفاق سے شیشہ ٹوٹا اور کلائی بالکل لہولہان ہوگئی اس وقت الیاس کی بیچینی بیان نہیں ہو سکتی آنکھ سے آنسو نکل پڑے رومال بھگو کر کلائی پر باندھا اور کہنے لگا اس خون کا ہر قطرہ میرے کلیجہ سے نکل رہا ہے کاش میرا پورا ہاتھ کٹ جاتا میں مر جاتا شہید ہو جاتا مگر میری وجہ سے اس سرخ و سفید کلائی کو یہ اذیت نہ ہوتی ؛

شہزادہ یہیں تک پہنچا تھا کہ میری ماں اسے خاصۂ فطرت کے موافق والد مرحوم کی طرف متوجہ ہونے اور کہنے لگی "

"سچ ہے انسان سے زیادہ محبت کی قدر کوئی مخلوق نہیں کر سکتی" یہ کہکر وہ اور اس کے پیچھے پیچھے ہم باپ بیٹے لُٹے اور اپنے گھر کو واپس آئے۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ اس واقعہ سے کتنے روز بعد ایک روز میں سمت مشرق سے آ رہا تھا رستہ میں جریدہ ارسلوان پڑا میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ شہزادی کو جس کے ساتھ مجھے اُس رات اسی ہمدردی ہو گئی تھی بغیر دیکھے چلا جاؤں چنانچہ میں قصر سلطانی پر پہنچا دوپہر کا سنسان وقت تھا اور گرمی نہایت شدت سے پڑ رہی تھی دیکھتا کیا ہوں کہ الیاس غمگین و محزون بیٹھا رو رہا ہے دفعتہً ایک شخص آیا اور خط لے کر چلا گیا مجھے سخت تعجب تھا کہ الیاس نے سینکڑوں مرتبہ وہ خط کھولا پڑھا اور سر آنکھوں پر رکھا آہ آہ اور بلند کہنے لگا "ظالم اب تک اسی ہٹ پر قائم ہے" کہ شہزادی کی زندگی میں مجھ سے کسی تعلق کی امید بالکل فضول! خیر یہ کیا بڑی بات ہے۔ لاؤ آج اس قصہ کا بھی فیصلہ کردوں یہ کہکر الیاس اندر گیا اور ایک خنجر آبدار لیکر باہر نکلا اس کی دھار دیکھی اور کمر میں لگا کر اس کمرہ میں آیا جو میری آنکھوں کے سامنے تھا آہ بیادری مادہ آگے بیان کرتے ہوئے کلیجہ کٹتا ہے۔ وہی شہزادی جو کسی وقت الیاس کے دل پر اچھی طرح قابض اور تمام سلطنت کی مالک تھی سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی اور آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے الیاس کی صورت دیکھتے ہی شہزادی گھبرا کر اٹھی گو وہ بالکل ساکت کھڑی تھی مگر سر سے پاؤں تک ایک ثابت قدمی کی تصویر تھی اس کی بڑی اور رسیلی آنکھیں جو اس وقت گلابی ہو گئی تھیں بحسرت و یاس الیاس کے چہرہ پر تھیں اور اس کے تکلیف دہ خیالات کی پریشانی کا اظہار اس کی صورت سے ظاہر تھا نرم اور نازک رخسار گلاب کی پتیوں کی طرح آفات ناگہانی سے مرجھا چکے تھے اور وہ دل جس پر کبھی عشرت و شادمانی کا راج تھا اس وقت مصائب کی لوٹ بنا ہوا تھا۔

پہلو میں ننھا سا دل رکھنے والی بانو! مجھے اندیشہ ہے کہ اب واقعات تجھ کو دہلا نہ دیں۔ جس وقت سفاک الیاس نے کمر سے خنجر نکالا اس کی چمک دیکھ کر شہزادی سہم گئی اوسان جاتے رہے تھر تھر کانپنے لگی۔ الیاس آگے بڑھا شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور کہا تیرا جام عمر لبریز ہو چکا یہ خنجر تیرا کام تمام کر دیگا ادھر آ۔ اور مرنے کے واسطے تیار ہو۔

ایسا کہکر خنجر اٹھایا چاہتا تھا کہ کام تمام کرے۔ شہزادی نے یہ سب یہ الفاظ کہے:-
میں بے گناہ ہوں جس دن میں آج سے پندرہ برس پہلے میری محبت کے حالات پھرے ہوئے مجھے آج اس میں قتل کی تجویزیں ہیں بادشاہ جن آنکھوں سے آج خون ٹپک رہا ہے یہ کبھی میری طرف پیار و محبت سے بھی اٹھی ہیں اگر تیری کامیابی صرف میری موت پر منحصر ہے تو میں یہ جان قربان کرتی ہوں لیکن بے وفائی کا الزام مجھ پر اور بہتان ہے الیاس وہ کام نہ کر کہ میرے دونوں بچے دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کریں میں جانتی ہوں کہ تھوڑی دیر میں میرا جسم اس فرش پر تڑپ رہا ہوگا اور جب تک تیری آنکھیں مجھ کو مردہ نہ دیکھ لیں دل ٹھنڈا نہیں ہو سکتا میں اپنا خون معاف کرتی ہوں بائیس برس تیرے ساتھ زندگی بسر کی تیری بدولت دنیا کے لطف اٹھائے ایک ایسے رفیق کو جان نذر کر دینی کوئی بڑی بات نہیں اب میں اجازت دیتی ہوں کہ تو شوق سے اپنی خواہش پوری کر۔

ابھی یہ پہلا فقرہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ظالم الیاس نے آبدار خنجر کو حرکت دی اور عین اس وقت جبکہ مظلوم شہزادی کی آنکھیں اپنے خاوند کے چہرہ کو تک رہی تھیں اس کے کلیجہ میں بھونک دیا۔

کیوں بانو؟ کیا وہ مذہب اور اخلاق اور قانون جس پر انسان بہت کچھ نازاں ہے اور سمجھتا ہے کہ ابتدائے دنیا سے آج تک ہم نے بہت کچھ ترقی کر لی یہی تعلیم دیتا ہے؟ کیا وہ شہزادی جس نے عفت و عصمت جیسی چیز قربان کر دی کیا وہ عورت جس کو الیاس نے زبردستی اسی محبت کا یقین دلایا اسی سلوک کی مستحق تھی؟ کس طرح سنگدل الیاس کا ہاتھ ایک بے گناہ برسوں کی رفیق اور برسوں کی ساتھی عورت

پیریڈ ۱

یہ کچھ ایسا درد انگیز سماں تھا کہ میرے پر شل اور ہاتھ پاؤں شل ہو گئے طاقت پرواز نہ رہی آفتاب
غروب ہو چکا تھا میں نے وہیں بسیرا لیا اور رات کو جس وقت میں نے یہ دیکھا کہ ایک نئی عورت الیاس کی
خوابگاہ میں داخل ہوئی اور الیاس اس کے استقبال کو اٹھا مجھ میں دیکھنے کی تاب نہ رہی میں اڑا اور راتوں رات
اپنے گھر پہنچا

میرا دماغ اس وقت بالکل صحیح نہ تھا پریشان خیالات نے میری تمام قوت زائل کر دی تھی ہر چند چاہا
تھا کہ تھوڑی سی نیند لے کر دماغ کو تسکین دوں مگر بیگناہ شہزادی کی آخری گفتگو میرے کانوں میں موجود تھی
اور میں کسی طرح نہ بھولتا تھا

غرض تمام رات بسر کی لیکن کائنات کی اس قابل ناز ہستی یعنی انسان کے مطالعہ کا مجھ کو اس قدر شوق ہوا
کہ میں پھر آبادی میں پہنچا شہر میں ایک پہاڑی تھی جس پر سہ منزلہ اور چو منزلہ مکان بنے ہوئے تھے ان میں سے
ایک بلند مکان دیکھ کر میں چھت پر جا بیٹھا۔

قوت مشاہدہ میری مددگار تھی تمام شہر میری آنکھ کے سامنے تھا اور میری آنکھ افعال انسانی پر بغرض تحقیقات
پڑ رہی تھی میرا خیال تھا کہ وہ مابہ الامتیازات جس نے اس مخلوق کو اشرف بنا دیا حیات انسانی کی رہنمائی ہو گی
مگر مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان سیکڑوں اور ہزاروں ذی روح لوگوں میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہ آیا جس پر انسان
کا اطلاق جائز ہو سکتا۔

اُن بخارات کی طرح جو شدت حرارت و تمازت آفتاب سے پہاڑ کی چٹانوں یا تپتے ہوئے کرہ زمین سے نکل کر
ہوا میں اڑتے رہتے ہیں میری نگاہ ابھی تک کہیں ٹھہری نہ تھی اور مطالعہ انسان کے اشتیاق نے مجھ کو اس قدر
بے تاب کر دیا تھا کہ قوت باصرہ کی رفتار جو آخر تک پہنچ چکی تھی رنگ برنگ کی اشیا مختلف ہیئت و
صورت کے اجسام سامنے سے گذر رہے تھے مگر چونکہ متجسس نگاہ سرعت کے ساتھ دیکھ رہی تھی میں ان میں سے

کسی کو تمیز نہ کر سکا یہاں تک کہ ایک زرد دوپٹہ بیچ میں آکر حائل ہوا اور میری تمام توجہ اسی طرف کھینچ لی۔ یہ
دوپٹہ انسان کے اس کمزور فرقے کے سر پر تھا جو عورت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ کپڑا بجائے
سرخ رنگ اور چمکدار ہونے کے پھٹا ہوا اور میلا کچیلا تھا اس لباس کا ظلم اور شہزادی کی مست درازی نے میرے
دل میں اس فرقے کی حمایت پیدا کر دی تھی میں نے سر سے پاؤں تک اس عورت کو دیکھا۔ گو شہزادی کی طرح
اس کے پاس دلفریبی کا کوئی سامان نہ تھا اور باوجودیکہ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے بجائے دل و دماغ
کو تروتازہ کرنے کے اس چار دیواری سے جس میں یہ موجود تھی ٹکرا ٹکرا کر واپس جاتے تھے تاہم اس کے
چہرے سے خوشی کا مینہ برس رہا تھا اور جہاں تک میرا قیاس حیوانی کام دے سکا میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فکر و غم
کی گھٹا اس کے قلب سے بالکل ناآشنا ہے افسوس میرے نتیجہ نے مجھ کو مغالطہ دیا میں نہ سمجھ سکا کہ یہ حالت
مستقل نہیں عارضی ہے اور یہ زور کا چھینٹا تھوڑی دیر میں کھل جائے گا اور یہ دل جو اس وقت
باغ باغ ہے اس پر حوادث کی بجلی چمک کر اور کڑک کڑک کر گرے گی ؛

یہ عورت ایک ٹوٹے سے کھرّے کھٹولے پر صحن میں بیٹھی تھی اور اندر اس کی ہم جنس
مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ اس زرد دوپٹہ میں مجھے کوئی چیز کلبلاتی ہوئی نظر آئی وہ کوئی
بے جان نہ تھی جاندار تھی اور طاقتور تھی اور یہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اس چمٹے ہوئے دوپٹہ کو
ہٹا کر باہر نکلے۔ مگر عورت کی طاقت غالب تھی وہ چاروں طرف سے دوپٹہ کو چھپاتی تھی اور چاہتی تھی کہ
قوت اور اس کا یہ فعل ان ہم جنسوں کے علم میں نہ آئے جو سامنے ہیں کچھ دیر تک ان دونوں میں کشمکش
رہی اور بالآخر چھوٹی طاقت میں بڑی طاقت کی طرف سے تھوڑی سی محبت شامل ہوئی دوپٹہ سرکا
تو میں نے دیکھا کہ ایک ننھا سا بچہ گود میں پڑا دودھ پی رہا ہے نرم رخساروں پر ہنسی کی پھریاں پیارے
پیارے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ماں کے منہ پر ٹکٹکی تھی بچہ کی یہ کیفیت دیکھ کر چونکہ میں خود صاحب اولا
تھا کس قدر خوش ہوا ہوں بیان نہیں کر سکتا اس کا ننھا سا دل دنیا کے تفکرات سے بالکل آزاد تھا

اس کی تمام سلطنت ماں کی گود تھی جس میں پڑا ہوا حکومت کر رہا تھا جس پیار اور محبت سے ماں کی نگاہیں اس بچہ پر پڑ رہی تھیں وہ کوئی میرے دل سے پوچھے جھکتی تھی طرح طرح کے منہ بنا کر چیختی تھی مختلف ناموں سے پکارتی تھی بھینچ بھینچ کر لپٹتی تھی اُس کی گود میں ایک ایسی لازوال دولت اور بیش بہا خزانہ تھا جس کی خوشی کا احساس کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا امتا دماغ میں خیال اور خیال میں بلندیاں دل میں حوصلے اور حوصلوں میں امیدیں پیدا کر رہی تھی اس کی حرکات قریب قریب محویانہ تھیں مگر کچھ ایسی خوشی سے لبریز تھیں کہ اس کا پتہ مجھ کو ان خوشیوں میں بھی نہ ملا جو الیاس و شہزادی کے پاس شب ماہ تھیں فرط محبت سے چومتے چومتے خیالات نے امیدوں کو جامہ کامیابی پہنانا چاہتی تھی کہ کلیجہ سے لگا کر سوئے ہوئے تھپڑ مارے دفعتہً ایک شخص سنگدل کی نگاہ لگی اور اس فقرے نے اس کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا :

"کیوں ری اماں کمبخت تو نے پھر لینے بچہ کو دودھ دیا"

خدا معلوم اس فقرے کی تہ میں ایسی کیا چیز چھپی تھی جو سیدھی دل پر تیر کی طرح جا کر لگی اور ہشاش بشاش چہرہ کو جس پر رنج و غم کا نشان تک نہ تھا بالکل سہما دیا اپنی عمر ہونے آئی مگر آج تک اپنی جلدی میں نے کسی آسمان کو بھی رنگ بدلتے نہ دیکھا جس کے وہم و گمان میں بھی انقلاب کا اندیشہ نہ تھا جو خلقت اور وسعت سب کو ہیچ سمجھ رہی تھی جس کی تمام خوشیاں جس کے تمام خیالات اس دو ڈھائی سیر کے لوتھڑے میں محدود تھے جس کے دماغ میں اس بے بہا نعمت نے اپنا سکہ بٹھا رکھا تھا اور جس کے دل میں یہ ننھا سا لال راج کر رہا تھا دفعتہً سٹ پٹا گئی بچے کو وہیں پٹخا اور سہمی ہوئی سامنے آ کھڑی ہوئی منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور گھگھیا گھگھیا کر کہہ رہی تھی :

"پہلے تو بیگم! بڑی دیر سے رو رہا تھا میں نے گود میں اٹھا لیا" ماں کی گود کا فراق اور دودھ کا چھٹنا تھا کہ ننھا سا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تعجب تو یہ تھا کہ ہر چند چیخا چلایا مگر واقعات نے ماں کو اتنی اجازت

نہ دی کہ اپنی صورت دکھا کر فوری رنج کی تلافی کر دی ہاں اتنا ضرور تھا کہ جوں جوں اظہار تکلیف میں جس کا ذریعہ رونے کے سوا بچے کے پاس کچھ اور نہ تھا زیادتی ہوتی جاتی تھی ماں کا خون خشک ہوتا جاتا تھا۔ میں دور بیٹھا ہوا بہت کچھ بڑبڑا کر رہ گیا بہتیرا غور کیا مگر قیاس نے مدد نہ دی کہ اس سنگدل عورت کے فعل پر کوئی رائے قائم کرتا ہر چند وجہ ارتکاب سوچتا تھا مگر کوئی خیال ٹھیک نہ بیٹھا۔ باوجود اس ناکامی کے دماغ نے کوئی صائب رائے نہ دی۔ چونکہ افراط خیالات کا مرض مجھ کو لاحق ہے میں اس جھگڑے کے الٹ پھیر میں پھنسا، ناممکن ہے کہ غلط ہو مگر میں جو قیاس لگا سکا اور جو رائے قائم کرنے پر مجبور تھا وہ یہ تھی کہ زرد دوپٹہ والی عورت کی کچھ ایسی اغراض ان ہمجنسوں سے وابستہ تھیں جن کا پورا ہونا ضروریات زندگی میں شامل اور بقاء حیات کا جزو لازمی تھا

مگر اے مادہ بشریت اسی کا نام ہے اور ان حرکات کا فاعل انسان کہے جانے کا مستحق ہے؟ لول لول پیاری مادہ کس دل سے اس شقی القلب عورت نے ماسیٹوں کے دور محبت کو درہم برہم کر دیا وہ ذرا سا دل جو آدمی سے پڑا ہوا کلکاریاں مار رہا تھا اس سنگدل کی وجہ سے چیخیں مار مار کر رونے لگا اور اس کو پروا بھی نہ ہوئی؟ محض اپنے بچے کی محبت یا اعتبار تمول برتر ہونے کا زعم یا اسی کے قریب قریب کچھ اور ہونے کی رعونت کیا سب جائز تھے؟ اس لئے کہ اپنی ہی جیسی عورت اپنی ہی جیسی انسان کی مامتا صرف اس وجہ سے کہ اس کی ضرورتیں اٹکی ہوئی ہیں۔ اپنی مامتا پر قربان کر دے اور ایسا ناجائز فائدہ اٹھائے کہ مجھ جیسے جانور تک لعن طعن کریں؟ لول لول پیاری مادہ کچھ تو بول ہنسے ہنسے کلیجوں پر تیر لگانے والی مخلوق مجروح دلوں پر برچھیاں چلانے والی مخلوق اور اشرف؟ توبہ ہائے آسمان پر بادشاہت اور زمین پر حکومت کرنے والی الامان الحفیظ بچائیو اس مخلوق سے جو انہی ارذل اور نیاوہ میں رکھیو اس فرقہ سے جو اس قدر خود غرض ہو

مادہ پیاری مادہ باتوں ہی باتوں میں دن کہیں کا کہیں پہنچا اور سورج سر پر آ گیا۔ میں نہ کہتا تھا کہ ابھی

عوس مخلوق کا صبح ہی صبح نام لیا خدا خیر کرے۔

خواہش یہ ہے کہ آئندہ کسی ایسی شے کا وجود میرے ذہن میں نہ ہو آور دامن کوہ میں چل جو کچھ کہا کچھ نہیں کہا ابھی بہت کچھ کہنا ہے ؛

میں اس تماشے میں ایسا محو اور اس واقعہ سے اسا متاثر ہوا کہ ٹھوک سانس غارت ہوئی ہر شید جی چاہا کہ پیچھے ابروں اور اپنے پروں کی ٹھنڈی ہوا سے معصوم دماغ تر و تازہ کروں مگر اندیشہ اور اندیشہ کیا یقین کہ اگر بھولے سے بھی ان حدود میں داخل ہو جاؤں گا جہاں حضرت انسان کے قدم پہنچتے ہیں تو آزادی کا خاتمہ ہو گا اور بے قینچ ہو کر کسی کونہ میں پھنسکہ نا جاؤں گا۔ اڑا اور جدھر منہ اٹھا ادھر کا رخ کیا جہاں انسان کی طرف سے اس قدر رعب آمیز خیالات میرے دماغ میں جگہ پکڑے جاتے تھے وہیں تحقیقات مزید کی خواہش اور یقین کی ضرورت بھی اس درجہ محسوس ہو رہی تھی کہ میں آبادی میں چکر لگا مارتا گرمی نہایت شدت سے پڑ رہی تھی اور چونکہ حرارت آفتاب اس وقت پورے زور پر بھی نازک مزاج انسان کو اتنی برداشت کہاں ہو کوئی تہخانوں میں گھسا کوئی سائبانوں میں ہاں ایک جگہ تین چار آدمی کھڑے ہوئے دکھائی دیئے ان کو دیکھ کر میں نے بھی طاقت پرواز کو کمزور کیا دیکھتا کیا ہوں کہ ایک موٹا تازہ آدمی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ادھر ادھر ٹہل رہا ہے ایسا ہی موٹا مگر عمر میں کچھ چھوٹا ایک شخص جس کی صورت بڑے موٹے سے بہت ہی ملتی جلتی تھی ایک طرف چپکا کھڑا تھا دو تین آدمی اور بھی تھے مگر مجھے دیکھ کر تو کیا کسی ضرورت ہی سے سمجھنا چاہئے باہر چلے گئے ؛

گو پچھلے واقعہ نے اس جیز کو جو انسانی و شیطانی حرکات میں مابہ الامتیاز ہے دماغ سے قریب قریب غارت کر دیا تھا مگر پھر بھی میں ایسی اعلیٰ و اشرف مخلوق سے بدظن نہ ہوا اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ انسانی تاریخ کے بدنما دھبے شاید مذہب کے رگڑوں کا مقابلہ نہ کر سکیں اور جو طبیعتیں اصول مذہب جیسی موثر شئے سے متاثر ہو چکی ہیں ان سے ایسی کمینہ حرکات کا ظہور نہ ہو گا۔ مگر جانور اور مجھ جیسے آزاد کے واسطے نہ تو آسان



نہ تھا کہ اس شخص [illegible] کی صورت دیکھ کر یہ نیت لگاؤں کہ یہ مذہب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے تاہم واقعات
پر نظر ڈالتے ہی پہلے میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے حکیم کو اسی غرض سے دیکھا اس کا سر منڈا ہوا
تھا لٹکے کا رنگ سفید [illegible] داڑھی پیشانی پر نور گھٹنوں سے اونچا پائجامہ۔ مختصر یہ کہ کچھ ایسا تقدس ٹپک رہا تھا کہ
میرے دل نے بلا تامل اس شخص کے انسان ہونے کی شہادت دی میں منتظر تھا کہ اس کے قول و فعل
سے کس طرح واقفیت حاصل کروں دفعتہً اس بڈھے مٹے نے چھوٹے موٹے سے کہا :

یہ صرف فتنہ پردازوں کی شرارت ہے جو تم کو میری طرف سے بھڑکا رہے ہیں میں اگر تمہارا
دشمن ہوں گا تو دوست کس کا ہوں گا یہ دولت اور ریاست سب مل جانے والی چیزیں ہیں مگر تم
جیسا لڑکا بھائی نہ ماں باپ زندہ ہو کر آئیں گے نہ نصیب ہو گا۔ صدقہ کر دوں تم پر سے وہ جائداد جو پہلے سے
دل میں میری طرف سے گرہ ڈالے بھائی سلیم تم نے کس طرح یقین کر لیا کہ میں حکام کو تمہاری بغاوت کا یقین
دلا رہا ہوں اور اس کمبخت موضع عزیز آباد کے واسطے ؟ لاحول ولا قوۃ اگر خدا کوئی چیز ہے اور مرنے کے
بعد اس کے حضور میں اعمال دنیوی کا جواب دینا ہے تو میں اس کو شاہد کرتا ہوں کہ اگر تم سے دغا کروں
تو خدا سے تم بلا تامل اس دستاویز پر دستخط کر دو واللہ باللہ تم باللہ اس کو میری بدنیتی پر محمول نہ کرو۔
تمہاری ریاست تم کو مبارک ہو میری یہ کوشش دوراندیشی پر مبنی ہے کہ اگر خدانخواستہ ایسی ویسی ہو تو یہ
آبائی نشانیاں جہاں باپ دادا کی ہڈیاں گڑی ہوئی ہیں نیست و نابود نہ ہو جائیں باپ دادا کا نام لیتے
ہوئے اس شخص کی آنکھ میں آنسو بھر آئے اور کچھ ایسے درد سے تقریر کی کہ چھوٹے موٹے نے فوراً ہی دستخط کر دیئے

نہ معلوم اس کاغذ میں کیا جادو کی دولت تھی کہ دستخط ہوتے ہی ڈاموٹا فارغ بارغ ہو گیا اور کاغذ ہاتھ میں لے یہ جا
وہ جا ابھی اس شخص کو گئے مشکل سے ایک گھنٹہ ہوا ہو گا کہ چند طاقتور انسان رنگ برنگ کی وردیاں
پہنے دندناتے گھس آئے اور اس چھوٹے موٹے کو زنجیروں میں جکڑ ایک طرف لے چلے اس شخص کی گریہ و
زاری اور اظہار بے گناہی پر کلیجہ کٹتا تھا ادھر یہ چھوٹی سی جماعت اور ادھر میں اکیلا مختصر یہ کہ ہم سب

ایک ایسی جگہ پہنچے جو عدالت کے نام سے تعبیر کی جاتی تھی سب سے پہلا شخص جس نے اس مظلوم کے باغی ہونے کی شہادت دی وہی بڑا موٹا تھا پس پیاری مادہ جانے تُو اس سے سر سے تلے سے دل کو بہت تکلیف پہنچائی ایسا نہ ہو اس قسم کے واقعات سن کر تیری صحت پر برا اثر کریں حقیقی بھائی سے زیادہ دوست کون ہو سکتا تھا اس شخص کو جلاوطنی کا حکم ہوا جس وقت اس کو کشاں کشاں لے چلے ہیں وہ نہایت حسرتناک وقت تھا قیدی نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا اور کہا بھائی جان موضع عزیز آباد میرے پاس رہا نہ تمہارے پاس رہے گا۔ چار دن کی زندگی کے واسطے تم نے مجھ سے میرے پیارے چھڑوائے۔ میں تو چلا لیکن اب تم اس جگہ چلنے کے واسطے تیار رہو جہاں میرا تمہارا انصاف ہوگا اور جہاں میری شکایت کے بعد اس کا فیصلہ ہو جائیگا ۔

تتا پیاری تتا کچھ تو بتا کیا اب بھی تو اس مخلوق کے ہمسایہ میں رہنا پسند کرتی ہے وہ دن اور آج کا دن میں نے تو عہد کر لیا کہ آبادی کی طرف رخ نہ کروں گا لیکن کل شام کو میں نے یہاں بھی حضرت انسان کی صورت دیکھی بس اڑ اور چل وطن کو خیر باد کہہ اور عزیز و اقارب کو خدا حافظ

راشد الخیری

پھر بھی عمر قید!!

ا

اس سے اچھی، اس سے عمدہ، اس سے بہتر جگہ ملنی طاہرہ کو تب ناممکن سی ہی تھی۔ ذرا غور تو کیجئے، بہت وسیع مکان کے، انشورنس، ولایت کے بیرسٹر، تہذیب یافتہ، روشن خیال، پھر سب سے زیادہ متمول، بس اور کیا چاہیے؟

رہی یہ بات کہ میر حسن کی مالی برتری ہونے کا سبب کیا تھا، ملتا ہے تو یہ کچھ قابل لحاظ بات نہیں، لڑکیاں وہ زمانہ جب فلاں بن فلاں کی بہت چھان بین کی جاتی تھی، اب تو شریف خون کی قدر بھیڑ بکری کے خون کے برابر بھی نہیں، یہ مان لیا کہ میر حسن کے باپ شبیر حسن دولت کے لحاظ سے نہایت کم رتبہ شخص تھے، بالکل صحیح ہے کہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں مفلسی کی وجہ سے محلہ کی سڑک والی لالٹین کے نیچے رات کے اکثر گھنٹے مدرسہ کا کام کرنے میں گزارا کرتے تھے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بیچارے مرتے مر گئے لیکن اپنی ٹکے گز کی چال کبھی نہیں چھوڑی، مگر بڑے مرد سے اکھڑنے سے کیا فائدہ؟ شبیر حسن نے اچھا نہ کھایا، اچھا نہ پہنا، زندگی کا کوئی لطف نہ اٹھایا لیکن کوڑی کوڑی کو دانت سے پکڑ کر رکھا تو سہی، تجارت کو اگر دین پرکھ کہا جائے تو بجا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ امیر حسن کو انہوں نے انٹرنس سے زیادہ نہ پڑھایا، تعلیم سے چھڑا کر فوراً تجارت میں لگا دیا، اور نوعمری کے زمانہ میں ہی میں غریب جگہ شادی بھی کر دی۔ اس نئی دلہن کو شادی کے بعد حقیقی مسرت کبھی حاصل ہوئی، خدا جانے کیا وجہ تھی بیچاری روز بروز کانٹا ہی ہوتی گئی مگر اس زمانہ کا انتخاب کیا نہ تھا؟ کچھ بھی نہیں، امیر حسن کے ہاں اولاد کے نام چوہے کا بچہ بھی نہیں ہوا، باپ کے مرنے کے دو سال بعد بیوی بھی قبرستان میں جا سوئی۔ یہ جھگڑا رہا نہ ٹنٹا، امیر حسن بالکل چھٹ پٹ ہو گئے!

تجارت کا کھیڑا بھی ٹھکانے لگا دیا، اور بڑے بڑے خیالات کی جھول بھی یکقلم اتار پھینکی۔ اب کوئی بات ہے،

جس پر کوئی معقول کر بھی انگلی اُٹھا سکے۔ ماں باپ کی بنائی ہوئی چارسو ماہوار کی جائداد اور چالیس ہزار نقد۔
سر آنکھ پیر جائیں، انگلستان جانا اور یورپ سے آٹھ سال رہ کر بیرسٹر ہو آنا کیا مشکل تھا؟ چلو یوں ہی سہی
کہ میر حسن صاحب آٹھ سال کے بعد کینچلی اتار کر مسٹر مارلیس بار ایٹ لاء بن کر ولایت سے واپس آئے تو
چالیس ہزار نقد کے بجائے دو ٹرنک سوٹوں سے بھرے اور کچھ بیش قیمت لوٹ اور ستور اگر پھر بھی بیرسٹری
کی سند اور چار سو روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی، موجودہ زمانہ میں بہت بڑی چیز تھی! کریلا اور نیم چڑھا سب سے
زیادہ بے فکری اور خود مختاری! خرچ اخراجات کے لئے نہ ماں باپ سے لڑنا تھا، نہ قلیل محنتانہ پر چھوٹی چھوٹی
عدالتوں میں مارا مارا پھرنا! نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہائیکورٹ میں کام شروع کیا اور ہمیشہ اس پر نظر
رکھی کہ "جلدی کام شیطان کا" رفتہ رفتہ سب ہی کچھ ہوا اور جو کچھ رہ گیا ہے وہ اب ہو جائے گا، لیکن سچ تو
یہ ہے کہ مارلیس نے جو کچھ کیا۔ نہایت اطمینان، نہایت خاموشی، اور نہایت ٹھاٹھ کے ساتھ کیا! اسپر لڑنا کہ پانچ
سال کی پریکٹس میں وکالت کی آمدنی ساڑھے نو سو ماہوار تک بھی نہیں پہنچی، ایک فضول سی بات
ہے! ہاں یہ امر قابل غور ہے کہ پچھلے سال مسٹر مارلیس پراونشل کاؤنسل کی ممبری کے لئے کھڑے
ہوئے تھے! اب یہ بات کہ مسٹر مارلیس کو ڈیڑھ سو میں سے کٹ کٹا کر کم و بیش دس رائیں ملی
تھیں، مجھ سے پوچھئے تو رائے دہندگان کی جہالت پر دال ہے کیونکہ ہندوستان کے رائے
دہندہ اپنی ذاتی رائے تو بلا مبالغہ اسی فیصدی کچھ رکھتے ہی نہیں اور ۲۰ فیصدی ایسے
ہیں جو روزانہ ہوا کے رُخ کے ساتھ اپنی رائے بھی الٹتے پلٹتے رہتے ہیں! مسٹر مارلیس اول
تو کسی کے پاس جانا ہی اپنی کسر شان سمجھتے ہیں اور اگر بھولے بھٹکے کہیں چلے بھی گئے تو
محض اُن کی شکل دیکھتے ہی دروغ برگردن راوی۔ بیس چوتھائی تختہ رائیں بالکل غائب! پھر
فریق مخالف نے ڈنڈا ہاتھ میں لے کر رائے دہندگان کی قلمسز کی مٹی لے ڈالی تھی ایسی حالت
میں ہندوستان جیسے جاہل ملک میں کامیابی ہونی معلوم، اور فقط صرف ایکسو چالیس رائیں قبضہ

سے نکل جاتی کچھ بھی تعجب خیز نہیں اگر فضول سی بات سے مسٹر مارلس کے لائق اعلیٰ تعلیم یافتہ،
سولائزڈ وغیرہ وغیرہ ہونے میں کیا فرق آسکتا ہے

صورت کے لحاظ سے بھی مسٹر مارلس کچھ بُرے نہیں رنگ گو یورپ کی گوری چمڑی والے کا سا نہیں،
لیکن سچ یہ ہے کہ مسٹر مارلسن اور اُنکے احباب اسکے ماننے کے لئے تیار نہیں تھے البتہ موزوں اور اچھا
ہونے میں کسی کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا ہاں عمر کا سوال کسقدر ٹیڑھا ضرور ہے کیونکہ انٹرنس کے سرٹیفکیٹ
کے حساب سے عمر کچھ زائد بات ہوتی بھی اگر سچ پوچھئے تو آج کل عمر کا صحیح اندازہ بھی ایک بہت مشکل کام
ہے ڈاڑھی اور مونچھیں تو ایک عرصہ سے فیشن کے تحت برطرف اور دور ہونے کے قابل سمجھی جانے لگی ہیں
یا پالٹکس کی زبان میں یوں سمجھئے کہ وہ اسقدر ناموزوں اور کمزور ہو گئی ہیں کہ اپنی ہستی خود قائم نہیں رکھ سکتیں
اور بیچارہ گروپ زیر رحم محض اصلاح خط کے لئے عیوب اور فضولیات دور کرنے کے لئے۔ انکی بارگاہ میں حاضر
ہوا تھا اب مجبور ہے کہ اس خود بخود کمزور ہو جانے والی چیز کو بالکل اسی طرح صاف کرتا ہے جس طرح یورپ
ٹرکی کو مختصر یہ کہ ڈاڑھی مونچھیں نئی روشنی نے اُڑا دیں، سر کے بالوں کا رنگ سیکڑوں قسم کے ہیر ڈائی نے
مشتبہ کر دیا۔ اور دانت امریکن ڈنٹسٹ کی وجہ سے مشکوک ہو گئے اب عمر کا اندازہ کیا جائے تو کیونکر؟ مگر
پھر بھی۔ ناسازیگا مسٹر مارلسن بلاشبہ عمر کے لحاظ سے پچاس کے صحیح رُخ پر ہیں ہاتھ پاؤں کے اچھے آنکھ ناک
سے درست، محنت سے بے پروا، روپیے سے مستغنی پھر سب سے زیادہ۔ سر سٹر سر سٹر ہی نہیں ٹوپ ہیٹ
سے لیکر پیٹنٹ لیدر شوز تک صاحب، صاحب ہی نہیں، آزاد خیال آزاد خیال ہی نہیں تمام دقیانوسی
باتوں سے ایک دم مبرا! اب بتائیے کہ قمر النساء کی اکلوتی لڑکی۔ مس فاخرہ ایسی سونے کی چڑیا کو اپنی
عالم آشوب اداؤں کے جال میں پھانس لے تو باعث فخر ہے یا نہیں ؟

مس فاخرہ کے والدین نے اول دن سے ہی زمانہ کی ہوا دیکھ کر مس فاخرہ کو تعلیم ولایت دلائی تھی! اُس نے
مشن گرل سکول سے باقاعدہ طور پر انٹرنس پاس کیا تھا، ٹینس میں پچھلے ہی سال کپ لے چکی تھی انگلش میں

ایسی نظر آپ ہی تھی، اور مختصر یہ کہ۔ ڈانسنگ اور اسکیٹنگ کو چھوڑ کر، سائیکلنگ، ہائکنگ، وغیرہ وغیرہ،
کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس میں وہ شریک ہو۔ شادی کا اعتبار اُسے ضرورت سے زیادہ ملا ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ
ایک حد تک عقلمند لڑکی تھی اور ایسی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے شادی کے معاملہ میں بڑے سے سوال کو ہمیشہ
پیش نظر رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے اخبار میں شادی کے عنوان میں "ضرورت ہے ایک
متموّل بیرسٹر کو شادی کے لئے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی" دیکھتے ہی اسکا کھوج نکالنا شروع
کیا۔ اول تو خود اس کی نظر، دوسرے زبیدہ والدین کا سمجھانا، غرض خواہ مخواہ اسے مسٹر مارس کی عمر کو
نظر انداز کرنا پڑا۔ دونوں غلط انداز نظریں اسٹرونگ کس کے لئے کافی تھیں، اور دو ہی ملاقاتیں باہم ربط
ضبط بڑھانے کے لئے کافی سے بھی زیادہ۔ چند ہی ملاقاتوں میں مسٹر مارس کو پھانس لیا جیسا ان کا خیر
نہیں، اور پھانستے ہی فوراً شادی کے لئے مجبور کرلیا بالکل سچ ہے۔ اگر فاخرہ نے پھر بھی تھوڑا بہت احتیاط
ہر بات میں ملحوظ رکھا۔ فلرٹیشن کے وقت بھی جو لی کی آزادی سے ہمیشہ پہلو بچاتا۔ نکاح کا دن بھی اسی مختصر
اور اصلاح شدہ مذہب اور مسٹر مارس کی ترقی یافتہ ذہنیت کو سمجھ کر گڈ فرائیڈے، مقرر کیا۔ اول
تو خود طرفین کی منتخب کردہ اور رضامندی کی شادی اُس پر ایسی متموّل اور پیرز جگہ، پھر اگر آج مس فاخرہ
کے والدین لڑکی کو بخیر و خوبی رخصت کرنے کے بعد خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے تو تعجب ہی
کیا ہے؟

۲

اتوار سے اب بھی فرصت نہیں، تیسرے پہر کا وقت حسب معمول کلب کی نذر ہوا۔ مغرب کے
بعد کھانا کھانا ہی تھا کہ دوستوں کی آمد شروع ہوگئی۔ اب جا کر اخبار کی فرصت ہوئی ہے تو اخبار ہاتھ سے
نہیں چھوٹتا۔ آج رات کے نو بجے، اور اخبار بینی! واقعی ہے بھی صحیح۔ شادی کی پہلی رات اور اخبار بینی؟
۳ بجے سہ پہر سے لیکر رات کے نو بجے تک جس شوق اور بے چینی کے ساتھ وقت گذرا، اسکو تو فاخرہ کا

دل چاہتا ہوگا یا جس کسی پر مٹتی ہوگی اُس کا دل چاہتا ہوگا، لیکن اسمیں شک نہیں کہ لڑکپن کے بعد سے شوق اُلجھن سے بدلا جاتا تھا!

فاخرہ ایک خوبصورت صوفے پر خاموش بیٹھی تھی، اگرچہ ایک کتاب اُسکے ہاتھوں میں بھی تھی، لیکن اسکی نظریں دردیدہ نظریں۔ کتاب کے صفحے کے بجائے ناصر کے چہرے تک جاتے اور خُدا جانے کیا کچھ دریافت کرنے میں مشغول تھیں۔ ناصر برابر والی کرسی پر نہایت انہماک کے ساتھ اخبار میں ہمہ تن غرق تھا۔ ڈرائنگ روم نہایت شاندار خوبصورت، اور آراستہ تھا فرنیچر سے پھول اور قالیچے الماری ٹنگی پڑی تھی، اور بجلی کی روشنی میں ایک ایک چیز اپنی دلکش خوبی کا اثر دیکھنے والے پر ڈالنے کے لیئے بتا سکتی تھی اگر فاخرہ؟ آہ! وہ ان سب چیزوں کی طرف سے غافل تھی اسلئے دیدہ کا وہ تیر اسے اسی طرف متوجہ نہ کرسکتا تھا، ڈرائنگ روم کی شان و شوکت اُسکا دھیان نہ بٹا سکتی تھی اُسکو اس وقت ایک خیال تھا۔ صرف ایک!

فاخرہ کا لباس اُسکے اوجِ حُسن کے لئے سونے پر سہاگے کا کام کر رہا تھا ہلکا اودی وضع کا ڈھیلا پائجامہ جو اس وقت بے خیالی کے سبب رانوں پر اکٹھا ہوکر خوبصورت اور سڈول پنڈلی پر سے کسی قدر اونچا اُٹھ گیا تھا جسپت اور اعلیٰ درجہ کی سلی ہوئی بلاؤز۔ جو سینہ اور کمر کو نہایت صاف طور پر الگ الگ کرکے دکھلا رہی تھی۔ مہین کریپ کا پیاری دوپٹہ جو سر سے ڈھلک کر گھونگر والے بالوں کو بل کھانے اور لہرانے کی پوری اجازت دیچکا تھا سہانی اور نہ جانے کیا کیا مگر فاخرہ کو ایک ہی فکر تھی۔ صرف ایک!

اُسکو اپنے حسین ہونے کا پورا پورا علم تھا اور یہ علم اور بھی زیادہ ستا رہا تھا! وہ جانتی تھی کہ سوسائٹی کے نوّے فیصدی نظر باز محض اُسکی ایک نگاہ کے لئے اپنا دل ہتھیلی پر لیئے پھرتے ہیں اور یہ جاننا اور بھی غضب ڈھا رہا تھا! وہ سمجھتی تھی کہ خواہ مخواہ کی شرم کو بالائے طاق رکھکر وہ نہ تک اشارۂ ابرو یا جنبشِ زیرِ لب سے اچھے اچھوں کو متوالا بنا دیتی تھی اور یہ سمجھنا اور زیادہ اُسکے چٹکیاں لے رہا تھا

مگر اس وقت پہلی رات کو تخلیہ میں مارلیں کے روبرو، اُسے ایک ہی پریشانی تھی۔ صرف ایک ا
اسکو یاد تھا کہ کوٹھی میں گھستے ہی مارلیں نے اسے اپنی آغوش میں صرف ایک دفعہ لیا تھا، مگر ساتھ ہی
اسے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ سینہ سے سینہ ملنے کے وقت جب کہ اُسکا سانس نہایت تیزی کے ساتھ آرہا
تھا اسے کچھ گرمی۔ کچھ کشمکش مطلق محسوس نہیں ہوئی تھی! وہ ابھی بھولی نہیں تھی کہ اسی وقت مارلین کے ہونٹ
اُسکے نازک اسکے نازک لبوں سے صرف ایک دفعہ ملے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی نہیں بھولی تھی کہ اس بوسئہ
مشترک کے موقع پر کوئی خاص جوش مقناطیسی لگاؤ اور مارلو
کے اتصال سے پیدا ہونے والی بجلی اسے نام کو بھی نہیں معلوم ہوئی تھی! وہ سب کچھ جانتی تھی لیکن
پھر انجان سا چاہتی تھی! وہ سب کچھ سمجھتی تھی لیکن پھر ناسمجھ سا چاہتی تھی! اس تمام علم و فہم کی وجہ سے
اسے ایک ہی اُلجھن تھی۔ صرف ایک ا

آخر مارلین اخبار کیوں نہیں چھوڑتا؟ فاخرہ کی دلی کیفیت کا اندازہ کیوں نہیں کرتا؟ اسکے بار بار پہلو
بدلنے کو کیوں نہیں سمجھتا؟ اُسکے انگڑائیاں لینے سے کیوں نہیں تاڑتا؟ وہ چاہتی تھی کہ مارلین اس سے
کچھ کہے! وہ منتظر تھی کہ مارلین اسکی مچلنے والی حسرتوں کا خیال کرے! وہ یہ چاہتی تھی کہ مارلیں اُسکی طرف
دیکھے اُسکے پاس آئے اُسے چھیڑے اسکو گدگدائے اور اسکے ساتھ نہائے ۔ سچ تو یہ ہے کہ اس غضب
تنہائی میں اسے ایک ہی کش مکش تھی۔ صرف ایک

ٹن، ٹن، ٹن۔۔ ۔ گلاس پر رکھی ہوئی ٹائم پیس نے دس بجانے شروع کئے! آواز کے ساتھ
ہی فاخرہ کی نظریں خود بخود اُسکی طرف اُٹھ گئیں! خوشنما اور بیش قیمت ٹائم پیس پر کیوپڈ خدائے عشق۔ لیے
تیروں کا ترکش پس پشت رکھے، ایک ہاتھ کندھے پر کمان ڈالے، دونوں پاؤں لٹکائے، جانے کس
انتظار میں ست سا بیٹھا تھا! اس خاموشی، اس سکوت، اس سناٹے میں وہ بھی غالباً مبہوت تھا! اپنے
تیرو کمان کو اور اسکے برمحل استعمال کو قطعی بھول گیا تھا! کیا اچھا ہو کہ اسکا ایک بے چین کرنے والا تیر مارلین

کے دل میں تزار و ہوکر اُسے وقت کی قدر سادے آج کا کام آج ہی کرنا سکھا دے اور کچھ بھی نہیں تو صرف ہوشیار رہی کرے ۔ ٹن، ٹن، ٹن ٹائم پیس اپنے یکساں وقفے کے ساتھ بس بجا چکی تھی اور اب اُسکی آخری آواز کی جھنکار کمرے میں گونج کر رفتہ رفتہ غائب ہوتی جا رہی تھی ۔ مارلیں نے اخبار ہاتھ سے رکھا اور فاخرہ کی نظریں اسکے چہرے سے ہٹ کر بے تحاشا کتاب کی طرف دوڑیں ۔ مارلس اپنی کرسی پر سے کھڑا ہوا اور فاخرہ کا دل فوراً نہایت سرعت کے ساتھ دھڑکنے لگا مگر افسوس وہ فاخرہ کے پاس آنے کے بجائے میز کے پاس گیا ۔ اور گھنٹی بجانے لگا کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک خادمہ اندر آئی اور حکم سننے کے انتظار میں کھڑی ہو گئی ۔ مارلسن نے ایک تھوڑے سے تبسم کے ساتھ ۔ غالباً زبردستی پیدا کئے ہوئے تبسم کے ساتھ خادمہ سے کہا یہ دیکھو مسز مارلسن کو اسکے بڈ روم میں لیجاؤ اور بے تکلف وہ لباس اُتار کر رات کے کپڑے پہنا دو ۔"

آخر بڈ روم میں جانے کا وقت آ گیا ۔ رات کا لباس پہننے کا موقع آ پہنچا ۔ یہ تو آپ خود اندازہ کیجئے کہ ان الفاظ نے فاخرہ کے کان تک پہنچ کر اسکے دل و دماغ پر کیا اثر کیا ہوگا ؟ البتہ یہ ہم ضرور کہیں گے کہ وہ اُٹھتے وقت جھجک جھجک کر اُٹھی ، چلتے وقت رک رک کر چلی ، اور خادمہ کے ساتھ بڈ روم میں جاتے ہوئے اُسے کچھ پسینہ سا آ گیا ! اسکے جاتے ہی مارلیں نے گھنٹی سے ملازم کو بلایا اور "چائے" کے لئے حکم دیا ۔ اب پھر وہ اپنی پہلی کرسی پر جا بیٹھا ۔ جا بیٹھا اور اخبار بینی میں ڈوب گیا ۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

فاخرہ کو کپڑے اُتار کر رات کا لباس پہنتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی ، اسکو مسہری پر لیٹے ہوئے گھنٹے گذر چکے تھے ۔ معمولی سی آہٹ پر اسکا دل دھڑکنے لگتا تھا ۔ ذرا سے کھٹکے پر وہ آنکھیں بند کر کے سونے بیٹھا تی تھی ! کئی مرتبہ اسکے تمام بدن میں غیر معمولی کیفیت

پیدا ہوئی اور حیرانی رہی، کئی مرتبہ پسینہ اسکے چہرے اور پیشانی پر ظاہر ہوا اور غائب ہو گیا، اور کئی مرتبہ وہ عین انتظار میں اپنی قوت متخیلہ کے دھوکوں میں آکر پوری تکلیف اٹھانے کے بعد آپے میں آ گئی !!

ہمیشہ کے آنے جانے والی نیند نے بھی اس سخت روح فرسا کشمکش کے موقعہ پر ساتھ چھوڑ دیا تھا! اُسنے آنکھیں بند کرکے سونا چاہا، اپنے دماغ سے پریشان خیالات کو نکالنا چاہا، اسنے کروٹیں بدل بدل کر غافل ہونا چاہا، مگر خدا جانے کیا چیز تھی جو برابر خلجان دے رہی تھی؟ کیا خیال تھا جو نکالے نہیں نکلتا تھا؟ اور کیا بے چینی تھی جو کسی طرح دور نہیں ہوتی تھی؟

آہ، دنیا اور دنیا کی بہت سی خواہشات! خواہشات اور خواہشات بھی جسمانی، نفسانی اور انسانی بھی عالم شباب میں، عالم شباب اور عالم شباب میں شادی کی پہلی رات، جس سے بڑھ کے دوسالہ رق اور برق صبر سوز !! اور نمونۂ قیامت !!!

بڑھ! اے انتظار کے کاٹے نہ کٹنے والے وقت، قسم ہے تجھکو عمر خضر کی! بڑھ! اور بڑھ! جیسے اٹھتی جوانی کے ارمانوں کے دریائے بے پایاں۔ قسم ہے تجھکو طوفان نوح کی بڑھ! بڑھ اور ڈبو دے تمام مصنوعی رسم کو، تمام دنیاوی عقائد کو، تمام لغو مفروضات کو، تمام خلاف فطرت بندشوں و قیود کو ڈبو دے، غرق کردے! فنا کردے !!!

اسکا سر چکرانے لگا، آنکھیں پتھرا سی گئیں، ناقابل برداشت گرمی محسوس ہوئی، سانس اُلجھا، دم الٹا، دل گھبرایا اور وہ فوراً اُٹھ بیٹھی! اٹھ بیٹھی اور کھڑی ہوگئی! مسہری کے برابر ہی کشمیری کی الماری کھڑی تھی، جسکے سامنے کے رخ پر قد آدم آئینہ لگا تھا، اور اس آئینہ میں بجلی کی روشنی میں فاخرہ کا عکس سر سے پیر تک بالکل صاف نظر آرہا تھا! کھڑے ہوتے ہی خود بخود فاخرہ کی نظر آئینہ پر جا پڑی، نہیں نہیں، آئینہ کے دل ربا دینے والے عکس میں اور کسی کو نہ پاکر اسی کو زبردستی اپنی طرف متوجہ کرلیا!

وہ انتظار اور بستر کے خمار میں ڈوبی ہوئی اداسی وصبح کی سیاہ آنکھیں پردہ نشیں اچھولی بولیاں!
وہ کالے بھونرا لے خمار بوسہ ابرو آسمانِ حسن کے مانی لباس والے لال اور وہ چکنے گداز اور سرخ رخسار، فرشتۂ
جنتم ولب ساکے معبود اور وہ گھس دار اور بل کھانے والے گیسو سب ہی کی سیاہی اور روز محشر کی درازی کے
لب جگر! وہ لمبی اور صراحی دار گردن! پھر اس پر غضب رات کا لباس بیچ گریباں اور ملا آستینوں والا
کامہی بخش ابھرے بھرے مونڈھے اور گورے گورے بازو، گردن کے نیچے سے
گریبان کی حد تک ایک عجیب سا سیب کے ساتھ ابھرے والا سرخ وسپید جسم، سینہ سے کمر تک دونوں
جانب سی غضب کا اُبھار، عرض قدرت کے فیاض ہاتھوں سے بکتے ہوئے عطیات کا مع سحر ل نشست ذار
کے پورا پورا اظہار! اف! غضب! آف!! قیامت!!!

سوچئے ضرور سوچئے! دیکھنے والے کا کیا حال ہوا ہوگا؟ نظریں کہاں کہاں لوٹی ہوئی؟ آنکھیں کہاں
کہاں گم گئی ہوگی؟ دل کس کس جگہ مچل گیا ہوگا؟ سوچئے پھر سوچئے: دیکھنے والا تعلیم یافتہ ہے، روشن خیال
ہے، سوسائٹی سے واقف ہے، محسن ہے، اُس کو دنیا میں آنکھیں کھولے ہوئے بیس برس گزرے ہیں، اُسکی
شادی کی پہلی رات ہے، وہ ارمانوں کی کشمکش سے گھبرا رہا ہے، وہ انتظار کی کند چھری سے اتنی دیر تک
ذبح کیا گیا ہے کہ رات کے تین بج چکے ہیں، اور اب وہ ایک آئینہ کے سامنے سر سے پیر تک اپنے
حسن عالم سوز کو بغیر کسی حجاب یا پردے کے اچھی طرح دیکھ رہا ہے! ہائے - قسم ہے آپ کو تمام مغربی
تہذیب، تعلیم، اور بالخصوص موریلیٹی کی - ضرور بتلائیے اس نے کیا کیا دیکھا
ہوگا؟ کیونکر دیکھا ہوگا؟ اور کیا کچھ سوچا ہوگا؟!

جس طرح غریب فرہاد جدا ہونے کسی کوہ کنی جان گداز تکلیف کے بعد جوئے شیر لایا تھی اور ناکامیاب تھا
اسی طرح بیچاری جاجرہ - فی الحال رائے مسز مارسن سے بحث وقت کے سامنے سام کو صحیح کر سکی اور پھر بھی
وہی ایک فکر، پریشانی، الجھن، کشمکش اب بھی تھی - پہلے سے زیادہ تھی!!

۳

رات نے دن کا، اور دن نے رات کا لباس پہنا۔ ہفتے نے مہینے کا اور مہینے نے موسم کا روپ بھرا جاڑے نے گرمی کا اور گرمی نے برسات کا بھیس بدلا، آسمان میں سو بیسٹھ دفعہ زمین نے بلا گردان ہوا ہوا پار میں نے چکر لیتے ہوئے ایک مرتبہ آفتاب کا پورا طواف کیا؛ گھنگھور گھٹائیں اٹھیں اور برس گئیں، زور و شور کی آندھیاں آئیں اور اتر گئیں؛ دل تڑپا دینے والی بجلیاں چمکیں اور تھم گئیں۔ سو بار کلیاں کھلیں اور کمھلا گئیں۔ سب کچھ ہوا اور ہوا! لیکن آہ! فاخرہ کی تقدیر نہ پلٹنی تھی نہ پلٹی، وہ شادی کے ایک سال بعد بھی ویسی ہی تھی جیسی ایک سال پہلے!!

آرام کی جگہ آرام، اور روپیہ کی جگہ روپیہ، مارلین کا پیٹھ پیچھا ہے اس نے فاخرہ کے خوش رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا! اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا، عمدہ سے عمدہ لباس! نوکر چاکر، جوڑی گاڑی، خدا کا دیا سب ہی کچھ تھا! روزانہ دونوں وقت ہوا خوری، رات کا وقت گزارنے کے لئے پیانو موجود! سال میں چھ مہینے پہاڑ پر، بڑے دن کے لئے بمبئی یا کلکتہ! پھر سب پر طرہ خود مختاری، آنے جانے ملنے جلنے کی پوری آزادی! کوئی بات ایسی نہ تھی جس کی شکایت فاخرہ کسی کے سامنے کر سکتی، مگر پھر بھی وہ روز بروز مضمحل ہوتی جاتی تھی، پژمردہ ہوتی جاتی تھی، اندر ہی اندر گھلتی جاتی تھی!!

صبر اور شکر؟ مگر صبر و شکر کی وہ عادی نہ تھی! تقدیر کا لکھا؟ مگر تقدیر کو وہ محض مہمل حیلہ سمجھتی تھی، بندہ عاجز مجبور؟ مگر وہ اپنے آپ کو اپنے کام میں کسی کا مجبور نہیں مانتی تھی! ماں باپ کی لاج؟ مگر اس لاج کے لئے وہ مر جانے کو کسی طرح تیار نہیں تھی! اس نے سوچا اور سوچا، غور کیا اور کیا، لیکن جہاں تک اس کی عقل کام کر سکتی تھی اس کو اس انتخاب میں دھوکا ہوا، بلکہ دیا گیا! اور سے غور و خوض کے بعد اسے اپنی غلطی صرف اسقدر نظر آتی تھی کہ اسے انتخاب سے پہلے ہر طرح اپنا اطمینان کر لینا چاہئے تھا

پوری آزادخیالی کے ساتھ جانچ لینا چاہئے تھا، اور فلرٹیشن کے وقت ہر دقیانوسی خیال کو اسے دماغ سے قطعی نکال دینا چاہئے تھا! عصمت وعفت کا خیال ہی وہ چیز تھا جس نے آج اُسے زندہ درگور کر دیا تھا! اور اب اس کا اس بیہودہ خیال کے نام رکھوں جذبہ بالیسا بالکل حق بجانب تھا! اسقدر تعلیم، ترقی اور آزادی کے بعد بھی عصمت کا پورا خیال اُسکی نظر میں موجودہ سوسائٹی کا مہلک نقص نظر آتا تھا! اب بھی اسے طبقۂ نسواں جاہل اور لغو قیود۔ ناقابل برداشت قیود میں جکڑا نظر آتا تھا!

کہنے والے مارلیس کو بُرا کہیں اور اسکو مجرم، گنہگار، غرض جو چاہیں بتائیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ مارلین نے کیا مقتضائے بشریت تھا! موجودہ فلاسفی بتاتی ہے کہ انسان خودغرض ہے اور زندگی ایک سخت مجادلہ ہے! اپنی ہستی کے قیام کے لئے ایک درخت کتنے آس پاس کے پودوں کو چوس جاتا ہے اور ایک جاندار کس قدر جانداروں کو ہضم کر جاتا ہے؟ محض قوت شامہ کو تسلی دینے کے لئے، محض اپنی ہوس کے بجھانے کے لئے کس قدر پھول عین بہار کے عالم میں توڑ لئے جاتے ہیں، مسل ڈالے جاتے ہیں، روند ڈالے جاتے ہیں؟ انسان ضرورت و بلاضرورت اپنی حتی الوسع ہر عمدہ اور حسین چیز کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے، وہ اپنے فائدے، اپنے آرام، اور اپنی مسرت کے خیال پر کسی دوسرے کے خیال کو کبھی ہرگز ترجیح نہیں دے سکتا! محبت کیا ہے؟ خودغرضی! دوستی کیا ہے؟ خودغرضی! عبادت کیا ہے؟ خودغرضی! بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کیا ہے؟ خودغرضی! خودغرضی، خودغرضی! آہ! انسان از سرتاپا خودغرض ہے! اور آخر مارلیس بھی انسان ہی تھا!

مارلیس نے اگر اپنا نقص چھپایا اور دھوکا دیا تو محض اسا دل جوئی کرنے کے لئے۔ بالفاظ دیگر وہی خودغرضی! افاخرہ نے اگر اسے منظور کر لیا اور دھوکے میں آگئی تو محض روپیہ کے خیال سے یعنی وہی خودغرضی! مارلیس کو زیادہ مورد الزام بنانے کی کوئی وجہ ہمارے سمجھ میں تو آتی نہیں! جب سانپ نکل گیا اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ؟ ہاں اماں باپ کے انتخاب میں اگر یہ نقص نکلا تو طبقۂ نسواں

کا حامی گروہ جوش آزادی میں جدا جائے ماں باپ کو کیا کیا کچھ کہہ گذرتا، لیکن یہاں تو مس
فاخرہ نے خود اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پیر میں کلہاڑی ماری تھی؛ اب اسکو فقط جاہلانہ کہکر ٹال دیا جاتا
ہے۔ البتہ اگر ماں باپ کے اصرار پر ایسا ہی جاہلانہ واقع ہوتا تو ظلم، جبر اور اندھی کوئیں
میں دھکا دینے سے تعبیر کیا جاتا! ایک ہی بات اور ایک ہی جبر کا نام ضرورت کے لحاظ
سے پلٹ ہی جاتا ہے!!

فاخرہ نے اکثر دقیانوسی خیال والی عورتوں کو بُرے شوہروں کو بھرتے سُنا تھا، صبر کے ساتھ
سخت سے سخت تکالیف برداشت کرتے دیکھا تھا، لیکن وہ یہ کہتی تھی۔ اور غالباً سچ کہتی تھی۔
کہ ان عورتوں کو اوّل سے ہی قناعت کا عادی سا بنا گیا تھا، تقدیر پر شاکر ہونا انکی رگ و پے
میں سرایت کر گیا تھا، اور شرافت آبائی و عصمت کا خیال بچپن سے ہی ان میں ٹھونسا گیا تھا!
ایسی حالت میں جو کچھ پڑے اپنے مستقل مزاجی کے ساتھ جھیلنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا! البتہ نئی تعلیم
دی جائے، آزاد خیال بنایا جائے، مذہب کی وقعت بالکل نکال دی جائے، خودسری انکو اسی طرح
برداشت کرینگی جس طرح ایک دقیانوسی تعلیم والی قطعی عقل کے خلاف ہے! واقعی فاخرہ کا یہ مقولہ
آب زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ "اس ادھوری آزادی سے پُرانے خیالات کی پابندی ہی بہتر ہے"
کیونکہ پابندی کی حالت میں ہوش سنبھالنے سے آزادی کا خیال تو دماغ میں آکر زندگی دشوار
نہیں کریگا! ایسی آزادی میں حرف کہ خواہ مخواہ ایک مفروضہ عصمت کے خیال سے نوجوان
لڑکیوں کو گندم نما جو فروش، مردوں کا شکار بنایا جاوے، اور زندہ درگور ہو جانے کا احتمال
باقی رکھا جائے! وہ سوچتی تھی اور سوچتی تھی۔ کہتی تھی اور یہی کہتی تھی کہ' آہ! کیا اچھا ہو کہ
مظلوم طبقۂ نسواں کو پوری آزادی نصیب ہو جائے، سوسائٹی میں دغا اور فریب کی گنجائش
نہ رہے، اور پُرانے جہالت آمیز خیالات انسان کے دماغ سے بالکل دور ہو جائیں!!

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ واجرہ کا انجام کیا ہوا؟ اسکی زندگی کہاں کٹی، کیونکر کٹی، اور کیسی کیسی بدنامی اور مصیبت سے اسکو سامنا کرنا پڑا؟ ہاں ہم بغیر کہے نہیں رہ سکتے کہ نئی روشنی، نئی ترقی نئی آزادی سب ہی کچھ موجود تھی، لیکن "**پھر بھی عمر قید**"۔

سلطان حیدر (جوش)

"مرزا مغل کی بیٹی"

غدر ۱۸۵۷ء میں جب باغی فوجوں نے بہادر شاہ بادشاہ کے مقبول و بہادر لڑکے مرزا مغل کو اپنا کمانڈر انچیف بنالیا اور مرزا مغل عملاً باغیوں کی سرداری کے کام انجام دینے لگے تو ایک دن ۴۹ انگریز عورت مرد بچے بوڑھے دہلی کے لال قلعہ میں باغی فوج کی شرارت سے قتل کیے گئے جس وقت ان انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کو دیوان خاص کے سامنے قتل کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تو مرزا مغل اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے قتل کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کی آٹھ برس کی لڑکی نرگس نام بھی پاس کھڑی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ انگریزوں کے بچے بھی قتل گاہ میں لاکر کھڑے کیے گئے اور ان بچوں نے بلبلا کر رونا شروع کیا اور ان کی مائیں گھٹنے ٹیک کر خدا سے پناہ مانگنے لگیں اور انہوں نے اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا کر زار و قطار رونا شروع کیا تو اس وقت وہاں کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ سے آنسو جاری نہ ہوں۔ مرزا مغل کے چند مصاحب جو ان کے پاس کھڑے تھے خصوصاً ان کی لڑکی نرگس نظر کے استاد مولانا علیم اللہ صاحب آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے صاحب عالم! یہ تو بڑی سفاکی کا کام ہے۔ عورتوں اور بچوں کا قتل کسی مذہب میں روا نہیں ہے اور اسلام نے تو سختی سے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ لہٰذا آپ فوج کو حکم دیجئے کہ

وہ ان عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرے مرزا مغل نے جواب دیا بیشک یہ بہت بڑے ظلم و ستم کی بات ہے مگر فوج کے جاہل سپاہیوں اور غصہ بھرے ہوئے افسروں کو روکنا اور اس بُرے کام سے باز رکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ بالکل جنگلی اور وحشی ہیں۔ اور انگریزوں سے باغی ہونے کے بعد اتنے خود سر اور بے مہرہ ہو گئے ہیں کہ کسی شخص کا حکم نہیں مانتے۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔

مولانا معین اللہ صاحب نے کہا صاحب عالم کو تو انہوں نے اپنا بڑا سپہ سالار بنا لیا ہے اور جہاں پناہ ظل سبحانی اعلیٰحضرت بادشاہ سلامت کو یہ اپنا حکمران تسلیم کر چکے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ یہ آپ کا یا آپ کے والد بادشاہ سلامت کا حکم نہ مانیں۔ آپ کو اس بات کی ضرور کوشش کرنی چاہیے کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ان انگریز عورتوں اور بچوں کے بین اور آہ و زاری کرنے سے آسمان و زمین کانپتے ہوئے نظر آتے ہیں:

مرزا مغل نے جواب دیا مولانا میں اور میرے والد کے نام کھلونے بنا دیئے گئے ہیں۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی میرا کہا مانتا ہے نہ بادشاہ سلامت کا۔ جب یہ انگریز عورت مرد گرفتار ہو کر آئے تو میں نے اسی مصلحت سے قلعہ میں حضرت بادشاہ سلامت کے پاس بھجوا دیا تھا کہ کسی صورت سے ان عورتوں اور بچوں کی جانیں بچا لوں مگر ان ظالم باغیوں نے قلعہ کے اندر بھی ان بیچارے انگریز مرد عورتوں اور مردوں کو اپنی گرفت کے اندر رکھا اور بادشاہ سلامت کے اثر کو کسی طرح قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ جب میرے کہنے سے دو ایک دفعہ بادشاہ سلامت نے نہایت تکلف سے کھانا ان بیکس قیدیوں کو اپنے خاصے سے بھجوانا چاہا تو باغی مزاحم ہوئے اور دقت کے ساتھ ان قیدیوں کو وہ کھانا دینے پر رضامند ہوئے ان کا اسی وقت سے خیال ہے کہ بادشاہ سلامت اور ان کی اولاد انگریزوں سے ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر بدبخت سپاہیوں نے میرے اور جہاں پناہ بادشاہ سلامت کے منہ در منہ یہ کہا کہ ہم نے اپنی جانوں کو اور سارے گھر بار کو تباہی میں ڈال دیا ہے مگر آپ اس کی کچھ قدر

نہیں کرتے اور بات بات میں انگریزوں کی رعایت کرتے ہیں اگر آپ لوگ اس سے باز نہ آئے
تو پہلے ہم آپ سب لوگوں کا ملوا سی صفایا کریں گے۔ مولانا! مجھے انصاف کرو ایسی جنگلی اور وحشی فوج سے
کیونکر سفارش کی جا سکتی ہے اگر اس وقت میں ان لوگوں کو عورتوں اور بچوں کو قتل سے منع کروں
تو یہ پہلے مجھ کو اور میرے بچوں کو اسی مقام پر لیجا کر قتل کر دیں گے جہاں ان بیچارے انگریز قیدیوں کو
ہلاکت کے ارادے سے لیکر گئے ہیں ۔

مولانا عین اللہ صاحب نے فرمایا "صاحب عالم کی یہ مجبوری خوب بجا ہے مگر اسلام حکم دیتا
ہے کہ مظلوم کی حمایت کے لئے اپنی جان کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیئے دنیا چند روزہ ہے چلئے آپ
میرے ساتھ چلئے میں خود جا کر ان باغیوں کو نصیحت کروں گا" مرزا مغل نے اس کا کچھ جواب تو نہ دیا مگر
اُن کے چہرے کے تذبذب اور سکوت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس خیال پر کچھ آمادہ ہو چلے
ہیں مگر قبل اسکے کہ وہ ایک لفظ اپنی زبان سے نکالتے ایک شخص نے جو مرزا کے مصاحبوں کے پیچھے کھڑا
ہوا تھا دوڑ کر مولانا عین اللہ صاحب کی پیٹھ میں ایک چھری ماری اور الٹے پاؤں یہ کہتا ہوا بھاگا
کہ کافروں کے دوستوں کی یہ سزا ہے۔ مرزا مغل کے صاحب اور خود مرزا مغل مولانا عین اللہ کو
سنبھالنے لگے اور دو ایک آدمی قاتل کے پیچھے دوڑے تاکہ اسکو گرفتار کریں مگر قاتل کوٹھے سے نیچے
اتر کر دوڑتا ہوا باغی سپاہیوں کے جھرمٹ میں جا کر چھپ گیا۔

چھری مولانا عین اللہ کے بائیں پہلو پر لگی تھی جس نے پسلیوں کو چیر کر دل کے دو ٹکڑے کر دیئے
اور بیچارے مولانا گرتے ہی رحلت کر گئے اور ایک بات بھی اُن کے منہ سے نکلنے پائی ۔

نرگس نظر گو بچی تھی مگر اپنے استاد کا یہ حال دیکھ کر پہلے تو کچھ خوف زدہ ہو گئی اور اسکے بعد
ہائے میرے والد مولوی صاحب کہکر رونا شروع کر دیا ۔

۲

باغی فوجیں بھاگ گئیں۔ انگریزی فوج نے دہلی فتح کر لی بہادر شاہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے۔ مرزا مغل مرزا ابو بکر وغیرہ فاتح فوج کے ہاتھوں اسیر ہو کر قتل کر دیئے گئے۔ اس وقت نرگس اپنی والدہ کے ساتھ جو مرزا مغل کی ایک مستورہ تھی اور بڑی بہل گاڑی میں سوار جنگل میں جا رہی تھی۔ گاڑی میں ایک نرگس دوسری اس کی ماں اور ایک خانم نام کی ماما تین عورتیں تھیں اور دو مرد اور مردوں میں ایک مرزا اگھسیٹا تھے جن کی دور کی قرابت شاہ عالم بادشاہ سے ہوتی تھی اور دوسرے مرزا مغل کی ڈیوڑھی کے داروغہ قدرت خاں تھے۔ گاڑی قطب صاحب کی درگاہ سے آگے بڑھ کر چھترپور کے قریب پہنچی تھی کہ سامنے سے چند سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ ان لوگوں نے سمجھا کہ انگریزی فوج آ گئی اس واسطے انہوں نے گاڑی کو راستہ سے بالکل ہٹا لیا اور چاہا کہ درختوں کی آڑ میں چھپ جائیں مگر گاڑی دس قدم بھی نہ بڑھنے پائی تھی کہ سوار قریب پہنچ گئے اور انہوں نے گاڑی کو گھیر لیا نرگس نظر نے دیکھا کہ ان سواروں میں وہ شخص بھی ہے جس نے مولانا عنایت اللہ کو شہید کیا تھا۔ اس وقت اس نے چپکے سے اپنی ماں کے کان میں کہا یہ انگریزی فوج نہیں ہے بلکہ باغی فوج ہے۔ سواروں نے گاڑی کو روک لیا اور کہا جو کچھ مال تمہارے پاس ہو ہمیں دے دو۔ مرزا اگھسیٹا نے ایک باغی سپاہی کو پہچان کر کہا، تم کو تو ہماری مدد کرنی چاہیئے نہ کہ الٹا ہم کو لوٹو۔ اس پر مولانا عنایت اللہ کے قاتل نے کہا تم لوگ مدد کے قابل نہیں ہو کیونکہ تمہاری مخبریوں نے انگریزوں کو فتح دلوائی۔ اور ہم کو بھاگنا پڑا۔ داروغہ قدرت خاں نے جواب دیا بالکل جھوٹ ہے۔ تمہیں لوگوں نے ہماری اطاعت نہ کی اور اتنی بڑی طاقت کے باوجود بھاگ کھڑے ہوئے اور ہمارا عیش و آرام اور گھر بار برباد کر دیا یہ فقرہ سُن کر باغی سوار بیتاب ہو گئے اور غضبناک ہو کر انہوں نے گاڑی بان اور مردوں پر تلواریں مارنی شروع کیں۔ چنانچہ مرزا اگھسیٹا، داروغہ قدرت خاں اور گاڑی بان اسی جگہ مارے گئے۔ اور بیچاری خانم بھی قدرت خاں کے بچانے میں تلوار کھا کر گر پڑی اور جان سے

گئی صرف نرگس نظر اور اسکی ماں زندہ بچیں باغیوں نے گاڑی کا سب اسباب لوٹ لیا یہاں تک کہ مقتولوں کے کپڑے بھی اتار لیئے نرگس نظر کی والدہ کے پاس جتنا زیور تھا وہ بھی چھین لیا اور نرگس نظر کے کانوں میں اور گلے میں جو گہنا تھا وہ بھی زبردستی اتار لیا۔ اس کے بعد وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ ان دونوں کو کون لے۔ ایک سوار نے کہا عورت جوان ہے اس سے میں شادی کروں گا اس کو مجھے دے دو اور اس کے عوض میرے حصہ کا زیور لے لو۔ مولانا عین الدین کا قاتل بولا اس لڑکی کو میں لوں گا کیونکہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کیا گیا اور نرگس کی والدہ کو ایک سوار نے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا اور نرگس نظر کو مولانا عین الدین کے قاتل نے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ نرگس نظر "اماں اماں" کہہ کر رونے لگی تو نرگس نظر کی ماں نے اس سوار سے کہا میری لڑکی کو بھی ساتھ لے لے تاکہ ہم دونوں ایک جگہ رہیں اس سوار نے کہا میں بھرت پور کا رہنے والا ہوں اور وہاں تجھکو لیکر جاؤں گا اور یہ سوار جس کے حصہ میں تیری لڑکی آئی ہے سوہنہ ضلع گوڑگانوہ کا رہنے والا ہے ہم اپنے آپس کی لوٹ کو بدلنا نہیں چاہتے۔ نرگس نظر کی ماں نے کہا اللہ مجھ پر رحم کرو اور میری اکلوتی بچی کو مجھ سے نہ چھڑاؤ مگر ان ظالموں کو ذرا رحم نہ آیا۔ اور بھرت پوری سوار نرگس نظر کی ماں کو لیکر بھرت پور چلا گیا اور مولانا عین الدین کا قاتل نرگس نظر کو لیئے ہوئے سوہنہ پہنچ گیا۔

۱۴

نرگس نظر کا بیان ہے کہ جب میری والدہ مجھ سے جدا ہونے لگیں تو وہ اپنے بال نوچتی تھیں اور دھاڑیں مار مار کر روتی تھیں اور میں بھی "اماں اماں" کہہ کر چیختی تھی مگر ان ظالموں کو ہم پر کسی طرح بھی رحم نہ آتا تھا۔ مجھ کو جب تک اماں کا گھوڑا نظر آیا اماں کو چیخ چیخ کر پکارتی رہی لیکن جب گھوڑا آنکھوں سے اوجھل ہوا تو میں بیہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو میں اس سوار کے مکان پر تھی وہ ذات کا گھوسی تھا اس کے گھر میں اس کی ماں اور بیوی تھیں اور کوئی نہ تھا۔ انہوں نے مجھ کو

دیکھا اور خاوند سے یہ سُنا کہ وہ مجھ کو بیٹی بنانے کے لئے لایا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی اور اسنے مجھ کو بہت پیار و محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔ آٹھ دن تک اس گھوسن نے میری ایسی خاطر کی کہ میں اپنی ماں کی جدائی کے غم کو بھول گئی آٹھ دن کے بعد یکایک انگریزی فوج کی ایک دوڑ آئی اور اُس نے میرے موجودہ باپ کو پکڑ لیا اور گھر کا تمام مال و اسباب ضبط کر کے لے گئی۔ مجھ کو میری گھوسن ماں نے بہت تسلی دی اور پڑوس کے ایک شخص کے ہاں لیکر چلی گئی۔ تین روز کے بعد ہم نے سُنا کہ وہ گھوسی بغاوت کے جُرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اس کا تمام مال و اسباب نیلام ہوگیا۔ وہ بیچاری گھوسن بھاگتے وقت کچھ نقدی اپنے ساتھ لے گئی تھی جس سے وہ دو سال تک اپنا گُذارہ کرتی رہی اور میری دلداری میں اس نے کسی قسم کی کمی نہیں کی۔

ایک روز رات کو ہمارے گھر میں چور آئے اور انھوں نے میری گھوسن ماں کے گلے سے ہنسلی اُتارنی چاہی۔ گھوسن ماں کی آنکھ کُھل گئی اور اُس نے غُل مچا دیا۔ اس پر چوروں نے گھوسن ماں کا گلا گھونٹ ڈالا اور وہ بیچاری اس صدمہ سے مرگئی۔

گھوسن ماں کے مرنے کے بعد ایک دو دن تک مکان والوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا بلکہ تسلی و تشفی سے پیش آتے رہے مگر تین دن کے بعد اس مکان والے کی بیوی نے کہا کہ اری او دن بھر بیٹھی رہتی ہے کچھ کام کیوں نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں مفت کی روٹی نہیں ہے خدمت کرے گی تو کھانے کو ملے گا میں نے کہا مجھے تم کام بتاؤ تم جو کچھ کہوگی میں وہی کروں گی اس عورت نے کہا گھر میں جھاڑو دیا کر، بھینسوں کا گوبر اٹھایا کر اور اُن کے اُپلے تھاپا کر میں نے جواب دیا اُپلے تھاپنے تو مجھ کو نہیں آتے، جھاڑو بھی میں نے کبھی نہیں دی، یہ کام میں نے کبھی نہیں کئے۔ میں ہندوستان کے بادشاہ کی پوتی ہوں مگر خدا نے یہ وقت

مجھ پر پڑا الا ہے تو جو کام تم کہو گی وہی کروں گی دو چار دفعہ مجھ کو یہ کام کر کے بتاؤ تاکہ میں سیکھ جاؤں وہ عورت بڑی رحم مزاج تھی اُس نے مجھ کو جھاڑو دینی اور اُپلے تھاپنے سکھا دیئے اور میں یہ کام کرنے لگی۔

ایک دن مجھ کو شدت کا بخار تھا اور اس کی تکلیف کے سبب مجھ سے اُپلے نہ تھاپے گئے۔ اس عورت کا خاوند گھر میں آیا اور مجھ کو پڑا ہوا دیکھا تو اس نے میرے ایک ٹھوکر ماری اور کہا دس بج گئے نواب تک پڑی سوتی ہے۔ یہ لال قلعہ نہیں ہے گھوسی کا گھر ہے اُٹھ کر بیٹھ اور گوبر تھاپ۔

گھوسی کے مارنے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں اُٹھ بیٹھی اور کہا مجھ سے خطا ہو گئی میں ابھی گوبر تھاپتی ہوں چنانچہ میں نے اسی بخار کی حالت میں جھاڑو بھی دی۔ اور اُپلے بھی تھاپے۔ اس وقت تو مجھے اتنی سمجھ تھی مگر آج جب مجھے اس مصیبت کا دھیان آتا ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ ان کمبخت ظالم باغیوں کی بدولت ہم لوگوں کو کیسی کیسی بپتا سہنی پڑی۔ ہم اس محل کے رہنے والے تھے جس کے اندر کا تصور شاعروں سے عجیب و غریب نظمیں لکھواتا تھا اور جہاں یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

مگر مصیبت نے یہ دن دکھایا تھا کہ ہم محلوں سے نکل کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے اور اُپلے تھاپتے تھے۔

دو سال اسی مصیبت میں گزر گئے آخر اس گھوسن نے اپنے بھائی کے ساتھ میری شادی کر دی جہاں میری ساری عمر بسر ہوئی۔

میں نے گھوسنوں کی زندگی میں جان بوجھ کر کبھی قلعہ اور اس کی بادشاہی کا خیال نہیں کیا مگر میں مجبور تھی کہ دل ہر دور بچپن کا وقت یاد دلاتا تھا اور سوتے میں بھی دیکھا کرتی تھی کہ میرے والد مرزا مغل مسند پر بیٹھے ہیں میں ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ لونڈیاں چنور ہلا رہی ہیں اور دنیا مجھ کو بہشت کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب آنکھ کھلتی تھی تو ٹوٹے ہوئے چھپر ایک چکی ایک چرخہ اور تین چار پائیوں اور تین بستو کے سوا گھر میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیا تم مرزا مغل کی بیٹی نرگس نظر ہو؟ تو میں صاف کہہ دوں گی کہ نہیں۔ میں ایک غریب گھوسن ہوں کیونکہ آدمی کی ذات وہی ہے جس کا کام وہ اس وقت کر رہا ہو۔

حسن نظامی

بوڑھی کاکی

بڑھاپا اکثر بچپن کا دور ثانی ہوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں ذائقہ کے سوا اور کوئی حس باقی نہ تھی اور نہ اپنی شکایتوں کی طرف مخاطب کرنے کا رونے کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ۔ آنکھیں، ہاتھ، پیر سب جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں۔ اور جب گھر والے کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف کرتے، کھانے کا وقت ٹل جاتا۔ یا مقدار کافی نہ ہوتی یا بازار سے کوئی چیز آتی۔ اور انہیں نہ ملتی تو رونے لگتی تھیں اور ان کا رونا محض بسورنا نہ تھا۔ وہ آواز بلند روتی تھیں۔ ان کے شوہر کو مرے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا سات بیٹے جوان ہو ہو کر داغ دے گئے اور اب ایک بھتیجے کے سوا دنیا میں ان کا اور کوئی نہ تھا۔ اسی بھتیجے کے نام انہوں نے اپنی ساری جائداد لکھ دی تھی۔ ان حضرت نے لکھاتے وقت تو خوب لمبے چوڑے وعدے کئے۔ لیکن وہ وعدے صرف قلی ڈپو کے دلالوں کے سبز

مانع تھے اگرچہ اس جائداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ دو سو روپیہ سالانہ سے کم نہ تھی۔ لیکن بوڑھی کاکی کو اب پیٹ بھر کر روکھا دانہ بھی مشکل سے ملتا تھا۔ اس میں پنڈت بدھ رام کی خطا تھی۔ یا ان کی بیوی روپا کی اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ بدھ رام طبیعت کے نیک آدمی تھے لیکن اسی وقت تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے۔ روپا طبیعت کی تیز تھی لیکن ایشور سے ڈرتی تھی۔ اس لئے بوڑھی کاکی کو اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی۔ جتنی بدھ رام کی نیکی۔

بدھ رام کو کبھی کبھی اپنی بے انصافی کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتے کہ اسی جائداد کی بدولت میں بھلا آدمی بنا بیٹھا ہوں۔ اگر زبانی تسکین یا تشفی سے صورت حال میں کچھ اصلاح ہو سکتی تو انہیں مطلق دریغ نہ ہوتا۔ لیکن مزید خرچ کا خوف ان کی نیکی کو دبائے رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اگر دروازہ پر کوئی بھلا مانس بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اپنے نغمہ بے ہنگام شروع کر دیتیں۔ تو وہ آگ ہو جاتے تھے۔ اور گھر میں آکر انہیں زور سے ڈانٹتے تھے۔ لڑکے جنہیں بڈھوں سے ایک بغض ہوتا ہے۔ والدین کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی کاکی کو اور بھی دق کرتے۔ کوئی چٹکی کاٹ کر بھاگتا۔ کوئی ان پر پانی کی کلی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں لیکن یہ تو مشہور ہی تھا۔ کہ وہ صرف کھانے کے لئے روتی ہیں۔ اسلئے کوئی ان کے نالہ و فریاد پر دھیان نہ دیتا تھا۔ ہاں اگر کاکی کبھی غصّہ میں آکر لڑکوں کو گالیاں دینے لگتیں۔ تو روپا موقع واردات پر ضرور جاتی۔ اس خوف سے کاکی اپنی شمشیر زبان کا شاذ ہی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ حالانکہ رفع شر کی یہ تدبیر رونے سے زیادہ کارگر تھی۔

سارے گھر میں اگر کسی کو کاکی سے محبّت تھی تو وہ بدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے اپنے حصہ کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی یہی اس کا ملجا تھا اور اگرچہ کاکی کی پناہ ان کی سائلانہ سرگرمی کے باعث بہت گراں پڑتی تھی لیکن بھائیوں کے دست تطاول سے بدرجہا قابل ترجیح تھی۔ اس مناسبت اغراض نے ان دونوں میں محبّت

اور ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ بدھ رام کے دروازہ پر شہنائی بج رہی تھی۔ اور گاؤں کے بچوں کا جم غفیر نگاہ حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ چارپائیوں پر مہمان لیٹے ہوئے نائیوں سے پیروں میں مکیاں لگوا رہے تھے قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا کبت سنا رہا تھا اور بعض سخن فہم مہمانوں کے واہ واہ سے ایسا خوش ہو رہا تھا گویا وہی اس داد کا مستحق ہے۔ دو ایک انگریزی پڑھے ہوئے نوجوان ان بیہودگیوں سے بیزار تھے۔ وہ اس دیہاتی مجلس میں بولنا یا شریک ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج بدھ رام کے بڑے لڑکے سکھ رام کا تلک آیا ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات گا رہی ہیں۔ اور روپا مہمانوں کی دعوت کے سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹیوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں۔ دوسرے میں سموسے اور پیڑاکیں بن رہی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے میں مصالحہ دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بڑھی کاکی اپنی اندھیری کوٹھڑی میں خیال غم کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ لذت آمیز خوشبو انہیں بیتاب کر رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں۔ شاید مجھے پوریاں نہ ملیں گی۔ اتنی دیر ہو گئی۔ کوئی کھانا لے کر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے لوگ سب کھا گئے۔ میرے لئے کچھ نہ بچا۔ یہ سوچ کر انہیں بے اختیار رونا آیا۔ لیکن اشگون کے خوف سے رو نہ سکیں۔

"آہا کیسی خوشبو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے ہیں۔ تو ایسے نصیب کہاں کہ پوریاں پیٹ بھر ملیں۔" یہ سوچ کر انہیں بے اختیار رونا آیا۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھنے لگی لیکن روپا کے خوف سے انہوں نے پھر ضبط کیا۔

بڑھی کاکی دیر تک انہیں افسوسناک خیالوں میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مصالحے کی خوشبو رہ رہ کر دل کو آپے سے باہر کئے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ پوریوں کا ذائقہ یاد کر کے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی

"کسے پکاروں آج لاڈلی بھی نہیں آئی دونوں لونڈے روز دن کیا کرتے ہیں آج ان کا بھی کہیں کچھ پتہ نہیں کچھ معلوم ہوتا کہ کیا کیا ہو رہا ہے"۔

بوڑھی کاکی کے چشم خیال میں پوریوں کی تصویر ناچنے لگی "خوب لال لال، پھولی پھولی نرم نرم ہوں گی روپلے خوب مائن دیا ہوگا۔ کچوریوں میں اجوائن اور الائچی کی مہک آ رہی ہوگی۔ ایک پوری ملتی تو ذرا ہاتھ میں لیکر دیکھتی۔ کیوں نہ چل کر کڑاہ کے سامنے ہی بیٹھوں پوریاں چھن چھن کر کے کڑاہ میں تیرتی ہوگی کڑاہ سے گرما گرم نکل کر کٹھوتے میں رکھی جاتی ہوگی۔" پھول ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں لیکن سیر باغ کا کچھ اور ہی لطف ہے

اس طرح فیصلہ کر کے بوڑھی کاکی اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی مشکل تمام چوکھٹ سے اتریں اور دھیرے دھیرے رینگتی ہوئے کڑاہ کے پاس جا بیٹھیں یہاں آنے پر کچھ وہی تسکین ہوئی۔ جو کسی بھوکے کتے کو کھانے والے کے سامنے بیٹھنے میں ہوتی ہے

روپا اس وقت ایک سراسیمگی کی حالت میں تھی کبھی اس کمرے میں جاتی۔ کبھی اس کمرے میں۔ کبھی کڑاہ کے پاس۔ کبھی کوٹھے پر۔ کسی نے باہر سے آکر کہا "مہاراج ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں ٹھنڈائی دینے لگی لیتے میں پھر کسی نے آکر کہا "بھاٹ آیا ہے۔ اسے کچھ دے دو" بھاٹ کے لئے سیدھا نکال رہی تھی۔ کہ ایک تیسرے آدمی نے آکر پوچھا۔ ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے؟ ذرا ڈھول مجیرا اتار دو؟ بیچاری اکیلی عورت چاروں طرف دوڑتی دوڑتے حیران ہو رہی تھی جھنجھلاتی تھی۔ کڑھتی تھی۔ پر غصہ باہر نکلنے کا موقع نہ پاتا تھا۔ خوف ہوتا تھا کہیں پڑوسن یہ کہنے لگیں۔ کہ اسے ہی میں اُبل پڑیں۔ پیاس سے خود اس کا حلق سوکھا جاتا تھا گرمی کے مارے پھنکی جاتی تھی۔ لیکن اتنی فرصت کہاں۔ کہ ذرا پانی پی لے۔ یا پنکھا لے کر جھلے یہ بھی اندیشہ تھا کہ ذرا نگاہ ہٹی اور چیزوں کی لوٹ مچی۔ اس کشمکش کے عالم میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھا تو جل گئی۔ غصہ نہ رک سکا۔ یہ خیال نہ رہا۔ کہ پڑوسن بیٹھی ہوئی ہیں۔ دل میں کہا

کہیں گی۔ مر جانے میں لوگ ہنسیں گے۔ تو کیا کہیں گے۔ جیسے مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے اسی طرح وہ
بوڑھی کاکی پر جھپٹی۔ اور انہیں دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر بولی "ایسے پیٹ میں آگ لگے۔ پیٹ ہے
کہ آگ کا کنڈ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھتے کیا دم گھٹتا تھا۔ ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا۔ دیوتاؤں کا بھوگ
تک نہیں لگا۔ تب تک صبر نہ ہو سکا۔ آکر چھاتی پر سوار ہو گئیں۔ بوچ ایسی جیبھ۔ دن بھر کھاتی نہ ہوتیں
تو جانے کس کی ہانڈی میں منہ ڈالتیں۔ گاؤں دیکھے گا تو کہے گا کہ بڑھیا بھر پیٹ کھانے کو نہیں پاتی
تب تو اسی طرح لو کھلائی پھرتی ہے (اس خیال سے اس کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا) ڈائن نہ مرے نہ ماچا چھوڑے
نام بیچنے پر لگی ہے۔ ناک کٹوا کے دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے۔ نہ جانے کہاں بھسم ہو جاتا ہے۔ اسے کھلا
چاہتی ہو۔ تو جا کر کوٹھری میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ کھانے لگیں گے۔ تو تمہیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی
نہیں ہو۔ کہ چاہے کسی کے منہ میں پانی تک نہ جائے۔ لیکن پہلے تمہاری پوجا کر دے۔

بوڑھی کاکی نے سر نہ اٹھایا۔ نہ روئیں۔ نہ بولیں۔ چپ چاپ رینگتی ہوئی وہاں سے اپنے کمرے میں چلی
گئیں۔ صدمہ ایسا سخت تھا کہ دل و دماغ کی ساری قوتیں سارے جذبات۔ ساری حسیات اسی طرف
رجوع ہو گئی تھیں۔ جیسے ندی میں جب کگار کا کوئی بڑا ٹکڑا کٹ کر گرتا ہے تو آس پاس کا پانی چاروں
طرف سے سمٹ کر اسی خلا کو پورا کرنے کے لئے دوڑتا ہے۔

کھانا تیار ہو گیا۔ آنگن میں پتل پڑ گئے۔ مہمان کھانے لگے۔ عورتوں نے جیونار گانا شروع کیا۔
مہمانوں کے نائی اور خدمت گار بھی اسی جماعت کے ساتھ مگر ذرا ہٹ کر کھانے بیٹھے ہوئے تھے لیکن
آداب مجلس کے مطابق جب تک سب کے سب کھا نہ چکیں۔ کوئی اٹھ نہ سکتا تھا۔ دو ایک مہمان جو ذرا
تعلیم یافتہ تھے۔ خدمت گاروں کی بے شعوری پر جھنجھلا رہے تھے۔ وہ اس قید کو بے معنی سمجھتے تھے

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھری میں جا کر پچھتا رہی تھیں۔ کہ کہاں سے کہاں گئی۔ انہیں رادھا پر غصہ
نہیں تھا اپنی عجلت پر افسوس تھا۔ سچ ہی تو ہے جب تک مہمان لوگ کھا نہ چکیں گے گھر والے

کیسے کھائیں گے۔ مجھ سے اتنی دیر بھی نہ رہا گیا۔ سب کے سامنے پانی اتر گیا۔ اب جب تک کوئی بلانے نہ آئے گا۔ نہ جاؤں گی"

دل میں یوں فیصلہ کرکے وہ خموشی سے بلاوے کا انتظار کرنے لگیں۔ لیکن گھی کی مرغوب خوشبو بہت صبر آزما ثابت ہو رہی تھی انہیں ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ معلوم ہوتا تھا۔ اب پتل بچھ گئے ہوں گے اب مہمان آگئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھو رہے ہیں۔ نائی پانی دے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے لوگ کھانے پر بیٹھ گئے۔ جیونار گایا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ دل کو بہلانے کے لئے لیٹ گئیں اور دھیرے دھیرے ایک گیت گنگنانے لگیں انہیں معلوم ہوا کہ مجھے گاتے بہت دیر ہو گئی۔ کیا اسی دیر تک لوگ کھا ہی رہے ہوں گے۔ کسی کی بول چال نہیں سنائی دیتی۔ ضرور لوگ کھا پی کے چلے گئے۔ مجھے کوئی بلانے نہیں آیا۔ روپا چڑ گئی ہے کیا جانے نہ بلائے۔ سوچتی ہوں کہ آپ ہی آئیں گی۔ کوئی مہمان نہیں کہ بلاؤں۔"

بوڑھی کاکی چلنے کے لئے تیار ہوئیں۔ یہ یقین کہ اب ایک لمحہ میں پوریاں اور مصالحے دار ترکاریاں سامنے آئیں گی۔ ان کے حس ذائقہ کو گدگدانے لگا۔ انہوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی۔ پھر دہی اور شکر سے۔ کچوریاں رائتے کے ساتھ مزے دار معلوم ہوں گی۔ چاہے کوئی برا مانے یا بھلا میں تو مانگ مانگ کھاؤں گی۔ یہی نہ لوگ کہیں گے۔ انہیں لحاظ نہیں ہے۔ کہا کریں اتنے دنوں کے بعد پوریاں مل رہی ہیں تو منہ جھوٹا کرکے تھوڑے ہی اٹھ آؤں گی"۔

وہ اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی آنگن میں آئیں۔ مگر بدقسمتی سے اشتیاق نے اپنی پرانی عادت کے مطابق وقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔ مہمانوں کی جماعت ابھی بیٹھی ہوئی تھی کوئی کھا کر انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ اور کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ اور لوگ ابھی کھا رہے ہیں یا نہیں کوئی اس فکر میں تھا کہ پتل پر پوریاں چھوٹی جاتی ہیں۔ کاش کسی طرح انہیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی دہی کھا کے زبان چٹخارہا

تھا۔ لیکن دوسرا سکورا مانگتے ہوئے شرماتا تھا کہ اتنے میں بوڑھی کاکی رینگتی ہوئی ان کے بیچ میں جا پہنچیں کئی آدمی چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آوازیں آئیں "ارے یہ کون بڑھیا ہے؟ یہ کہاں سے آگئی دیکھو کسی کو چھو مت دے"

پنڈت بدھو رام کاکی کو دیکھتے ہی غصہ سے تلملا گئے۔ پوریوں کا تھال لئے کھڑے تھے تھال کو زمین پر پٹک دیا۔ اور جس طرح بے رحم ساہوکار اپنے کسی بدمعاش مفرور اسامی کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹیٹوا لیتا ہے اسی طرح لپک کر انہوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں ہاتھ پکڑے اور گھسیٹتے ہوئے لاکر انہیں اس اندھیری کوٹھڑی میں دھم سے گرا دیا۔ آرزوؤں کا سرسبز باغ لو کے ایک ہی جھونکے میں ویران ہو گیا۔

مہمانوں نے کھانا کھایا۔ گھر والوں نے کھانا کھایا۔ باجے والے دھوبی۔ چمار بھی کھا چکے۔ لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے نہ پوچھا۔ بدھو رام اور روپا دونوں ہی انہیں ان کی بےحیائی کی سزا دینے کا تصفیہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر بیکسی پر۔ فتور عقل پر کسی کو ترس نہیں آتا تھا اکیلی لاڈلی ان کے لئے کڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بہت انس تھا۔ بیچاری بھولی سیدھی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اس میں بو تک نہ تھی۔ دونوں بار جب اس کے باپ اور ماں نے کاکی کو بے رحمی سے گھسیٹا تو لاڈلی کا کلیجہ اینٹھ کر رہ گیا وہ جھنجھلا رہی تھی کہ یہ لوگ کاکی کو کیوں بہت سی پوریاں نہیں دے دیتے۔ کیا مہمان سب کی سب تھوڑے سے ہی کھا جائیں گے۔ اور اگر کاکی نے مہمانوں کے پہلے ہی کھا لیا۔ تو کیا بگڑ جائے گا۔ وہ کاکی کے پاس جا کر انہیں تسلی دینا چاہتی تھی لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پوریاں مطلق نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کر رکھی تھیں۔ وہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اُٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی مجھے خوب پیار کریں گی!

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آئی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی تھی جب اسے یقین ہو گیا کہ اماں غافل سو رہی ہیں تو وہ چپکے سے اُٹھی اور سوچنے لگی کہ کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا صرف چولہوں میں آگ چمک رہی تھی۔ اور چولہوں کے پاس ایک کُتا لیٹا ہوا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازے والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کی دم ان کی گدا صاف نظر آتی تھی۔ مارے خوف کے اُس نے آنکھیں بند کر لیں اتنے میں کُتا اُٹھ بیٹھا۔ لاڈلی کو ڈھارس ہوئی۔ کئی سوتے ہوئے آدمیوں کی نسبت ایک جاگتا ہوا کُتا اس کے زیادہ تسکین کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اٹھائی۔ اور بوڑھی کاکی کی کوٹھری کی طرف چلی۔

بوڑھی کاکی کو محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے شانے پکڑے۔ پھر انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پہاڑ پر اڑائے لئے جاتا ہے اس کے پیر بار بار پتھروں سے ٹکرائے تب کسی نے انہیں پہاڑ پر سے پٹک دیا وہ بے ہوش ہو گئیں۔

جب اُن کے ہوش بجا ہوئے۔ تو کسی کی ذرا بھی آہٹ نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں کہ سب لوگ کھا پی کر سو گئے اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سو گئی۔ رات کیسے کٹے گی رام کیا کھاؤں؟ پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ ہا! کسی نے میری سُدھ نہ لی۔ کیا میرا ہی پیٹ کاٹنے سے دھن ہو جائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی دیا نہیں آتی۔ کہ بڑھیا نہ جانے کب مر جائے۔ اس کا جی کیوں دکھائیں میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ۔ اس پر یہ حال۔ میں اندھی اپاہج ٹھہری۔ نہ کچھ سوجھے نہ بوجھے۔ اگر آنگن میں چلی گئی۔ تو کیا بدھو رام سے اتنا کہتے نہ بنتا تھا کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں۔ پھر آنا؟ مجھے گھسیٹا پٹکا انہیں پوریوں کے لئے روپا نے سب کے سامنے گالیاں دیں انہیں پوریوں کے لئے اور اتنی درگت کر کے بھی ان کا پتھر کا کلیجہ نہ پسیجا سب کو کھلایا میری بات نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا تو اب کیا دیں گی

یہ سوچ کر کاکی مایوسانہ صبر کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رات سے گلا بھر بھر آتا تھا لیکن مہمانوں کے لحاظ سے روتی نہ تھیں۔

یکایک ان کے کان میں آواز آئی "کاکی اٹھو میں پوریاں لائی ہوں"۔

کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچانی۔ چٹ پٹ اٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے لاڈلی کو ٹٹولا۔ اور اسے گود میں بٹھا لیا۔ لاڈلی نے پوریاں نکال کر دیں۔ کاکی نے پوچھا "کیا تمہاری اماں نے دی ہیں؟"

لاڈلی نے فخر سے کہا "نہیں یہ میرے حصے کی ہیں"

کاکی پوریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہوگئی۔ لاڈلی نے پوچھا۔ "کاکی پیٹ بھر گیا؟"

جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی امس پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان چند پوریوں نے کاکی کی اشتہا اور رغبت کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ بولیں "نہیں بیٹی۔ جا کے اماں سے اور مانگ لاؤ۔"

لاڈلی۔ "اماں سوتی ہیں جگاؤں گی تو ماریں گی۔"

کاکی نے پٹاری کو پھر ٹٹولا۔ اس میں چند ریزے گرے تھے انہیں نکال کر کھا گئیں۔ بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں۔ چٹخارے بھرتی تھیں۔ دل مسوس رہا تھا کہ اور پوریاں کیسے پاؤں۔ صبر کا بند جب ٹوٹ جاتا ہے۔ تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ مستوں کو سرور کی یاد دلانا انہیں دیوانہ بناتا ہے۔ کاکی کا بیتاب دل خواہش کے اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ حلال و حرام کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر تک اس خواہش کو روکتی رہیں۔ یکایک لاڈلی سے بولیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو۔ جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔

لاڈلی اس کا منشا نہ سمجھ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا۔ اور انہیں لا کر جھوٹے پتلوں کے پاس بٹھا دیا اور غریب بھوک کی ماری فاتر العقل بڑھیا پتلوں سے پوریوں کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگی

دیہی کیسا الہڑ پن تھا۔ سالن کیسا مزہ دار۔ کچوریاں کیسی سلونی سموسے کتنے خستہ اور نرم! کاکی صور عقل سے تو خود عاری تھیں۔ کہ میں وہ کر رہی ہوں جو مجھے نہ کرنا چاہئے۔ میں دوسروں کے جھوٹے پتّل چاٹ رہی ہوں۔ لیکن بڑھاپے کی حرص مرض کا آخری دور ہے جب سارے حواس ایک ہی مرکز پر آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ بوڑھی کاکی میں یہ مرکز ان کا حس ذائقہ تھا۔

ٹھیک اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اُسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے۔ چونکہ چارپائی کے ادھر اُدھر تاکنے لگی۔ کہ کہیں لڑکی نیچے تو نہیں گر پڑی۔ اسے وہاں نہ پاکر وہ اُٹھ بیٹھی تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی جھوٹے پتّلوں کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے اور بوڑھی کاکی پتّلوں پر سے پوریوں کے ٹکڑے اُٹھا اُٹھا کر کھا رہی ہیں۔ روپا کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کسی گائے کی گردن پر چھری چلتے دیکھ کر اس کے دل کی حالت جو ہوتی۔ وہی اس وقت ہوئی۔ ایک برہمنی دوسروں کا جھوٹا پتّل ٹٹولے۔ اس سے زیادہ عبرتناک نظارہ ناممکن تھا۔ پوریوں کے چند لقموں کے لئے اس کی چچیری ساس ایسا ذلیل اور حقیر فعل کر رہی ہے! یہ نظارہ تھا جس سے دیکھنے والوں کے دل کانپ اُٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین رک گئی ہے۔ آسمان چکر کھا رہا ہے۔ دنیا پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے۔ روپا کو غصہ نہ آیا۔ غم کے سامنے غصہ کا کیا ذکر! درد اور خوف سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس ادھرم کا پاپ کا الزام کس پر ہے؟ اس نے صدق دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پرماتما میرے بچوں پر رحم کرنا۔ اس ادھرم کی سزا مجھے مت دینا ہمارا ستیاناس ہو جائے گا۔"

روپا کو اپنی خود غرضی اور بے انصافی آج تک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آئی تھی۔ "ہائے میں کتنی بے رحم ہوں جس کی جائداد سے مجھے دو سو روپیہ سال کی آمدنی ہو رہی ہے اس کی یہ درگت اور میرے کارن! اے ایشور! مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے۔ مجھے معاف کرو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں اُن کے اشارے کی غلام سی ہوئی تھی۔ اپنے

نام کے لئے اسی بڑائی کے لئے سینکڑوں روپے خرچ کر دئیے لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپے کھائے اسے اس تقریب کے دن بھی بھر پیٹ کھانا نہ دے سکی۔ محض اس لئے کہ وہ بڑھیا ہے۔ بے کس ہے بے زباں

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھولا۔ اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لئے ہوئے بوڑھی کاکی کی طرف چلی؛

آدھی رات جا چکی تھی۔ آسمان پر تاروں کے تھال سجے ہوئے تھے۔ اور ان پر بیٹھے ہوئے فرشتے بہشتی نعمتیں سجا رہے تھے۔ لیکن ان میں کسی کو وہ مسرت نہ حاصل ہو سکتی تھی۔ جو بوڑھی کاکی کو اپنے سامنے تھال دیکھ کر ہوئی۔ روپا نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "کاکی اٹھو کھانا کھا لو مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی اس کا برا نہ ماننا۔ پرماتما سے دعا کرو۔ کہ وہ میری خطا معاف کر دے"۔

بھولے بھالے بچے کی طرح جو مٹھائیاں پا کر مار اور گھڑکیاں سب بھول جاتا ہے۔ بوڑھی کاکی بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کے ایک ایک روئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں اور روپا بیٹھی۔ روحانی نظارہ دیکھ رہی تھی۔

"پریم چند"

گناہ کی رات

(۱)

ممتاز اپنے دفتر کے خوبصورت اور آراستہ کمرے میں، ایک نرم نازک اور سبز صوفے پر بیٹھا تھا، اس کا دایاں ہاتھ، جس میں ایک جلتا ہوا سگریٹ تھا صوفے کے دائیں بازو کی بلندی پر سہارا لئے ہوئے تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ، جس کی درمیانی انگلی میں ایک ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی درخشاں تھی۔ بار بار اس کی پیشانی سے اوپر کی طرف حرکت کرتا اور رہ رہ کے اس کے لمبے اور گھنے بالوں میں جذب ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں سامنے کی دیوار میں گڑی ہوئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دیوار میں کوئی مقناطیسی کشش ہے۔ جو اس کی نگاہ کو ہٹنے نہیں دیتی اس کا جسم بظاہر آرام و اطمینان کے مزے لے رہا تھا۔ مگر اس کا دماغ ایک مسلسل، ایک مرتعش، ایک متحرک خیال کے ساتھ ساتھ بے قرار تھا۔

وہ شریف تھا۔ ذہین تھا۔ عقل مند تھا۔ مگر اس وقت وہ اس رات کی یاد میں محو تھا۔ جس رات کو اس کی شرافت ایک مرگ ناگہاں کا شکار ہو گئی تھی۔ جس رات اس کا ذہن ایک خاص نقطۂ خیال کے اردگرد گھومنے کے سوا، اور ہر ادراک سے قاصر ہو گیا تھا۔ جس رات اس کی عقل خلاف معمول اس بات کے حق میں رائے دے رہی تھی۔ جس کو وہ اس رات سے پہلے نامناسب۔ مکروہ اور ناجائز خیال کرتا تھا

آہ! وہ رات تھی یا دنیا بھر کے طلسموں کا ایک زندہ مظاہرہ جس کی ایک ایک ساعت

کے ایک ایک عضو مکمل التقسیم حصے کے ساتھ اس کی امید اس کی حسرت اس کی خوشی کی یاد وابستہ تھی۔ اس نے اس رات اپنی عمر بھر میں پہلی مرتبہ موسیقی کو ایک زندہ عورت کے شکل میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔ جس کے جسم کی ہر اٹھتی ہوئی لے ہوا کے ذروں کو حسن بنا رہی تھی۔ اس نے اس رات ایک عورت کے پاؤں کی حرکت کو ایک شعر کی کیفیت اختیار کرتے دیکھا تھا۔ جس سے بے جان ریشم میں جان پیدا ہو گئی تھی۔

وہ رات ممتاز کے لئے ایک عجیب رات تھی۔ اس رات جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اس کا ذہن نہ سمجھ سکا تھا۔ جو کچھ اس کا ذہن محسوس کر رہا تھا اس کی آنکھیں نہ دیکھ سکتی تھیں ایک عورت ایک بے باک کیفیت بے حجابی میں انسانی جذبات سے کھیل رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دلوں میں امیدیں پیدا کر کے ان کو ایک جنگلی دیوی کی طرح پامال کر رہی تھیں۔ اسی رات اس نے دیکھا کہ ایک پارساؤں کی پارسائی، عقل مندوں کی عقل، ایک عورت کے ناز و انداز کی قربان گاہ پر مجروح ہو گئی اسی رات کو اس نے مرد کی کمزوری، عورت کی طاقت ضمیر کی بزدلی اور اخلاقی شکست کا تماشہ دیکھا۔

یہ رات گو دنیا کے لئے وقت کی عمر محدود مسافت میں اپنی معمولی منزل طے کر کے ختم ہو گئی مگر ممتاز کے لئے یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رات تھی۔ اس وقت بھی وہ اس رات کو اپنے دماغ میں اپنی آنکھوں میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کی زندگی کا دور رواں اسی رات تک چل کر رک جاتا تھا۔ اس کی یاد۔ اس رات کے سوا اور تمام واقعات کو فراموش کر چکی تھی۔

اس رات کو گزرے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ اس ایک مہینے میں اس نے دن رات کی ان تھک کوششوں، دولت کے اندھا دھند صرف اور اپنے ہمدردوں کے دماغ کی لگاتار کاوشوں سے

اس خوبصورت رقاصہ کے گھر تک رسائی حاصل کی۔ آہ حسن کے گھر کے دروازے ہر دوسرے شخص کے لئے دن رات کھلے رہتے تھے۔ ایک پُرفن دماغ عیاری سے مسافر کے لئے بند ہو گئے تھے۔ حسن نے عشق کی حسنگاری کو ایک روح سوز شعلے میں منتقل کرنے کے لئے اسا پُرانا مجرب اور کامیاب نسخہ استعمال کیا تھا۔

ہر کوشش کی ناکامیابی۔ ہر امید کی ناکامی نے مسافر کو پہلے سے زیادہ شائق کر دیا۔ آخر کار اس وقت جب زندگی اور موت صرف اقرار اور انکار پر منحصر تھی عقل اور جنوں صرف ایک بال اور بال کے درمیان راہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس کی فریاد سنی گئی۔ اس کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ ہاں اس نے اس وقت دولت کی طاقت کو محسوس کیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس قدر دولت مند تھا۔

اس کے بعد اس کی کھوئی ہوئی صحت دوبارہ عود کر آئی۔ اس کو دنیا پھر ہنستی ہوئی نظر آئی اس کو زندگی پھر جینے کے قابل معلوم ہوئی۔ مگر آخر کار اس کا سارا کاروبار ایک مسلسل بے توجہی سے بگڑ گیا۔ اس کے بوڑھے ماں۔ اس کی پیار کرنے والی بیوی۔ اس کی معصوم بہن سب کی کا آرام اجڑ گیا۔ اب اس کا وقت زیادہ تر اپنے دفتر کے کمرے میں گذر رہا تھا جو اس کے گھر سے دور ایک پر فضا مقام پر واقع تھا۔ وہ جب کبھی گھر جاتا۔ تو اس طرح جیسے کوئی اجنبی زیادہ سے زیادہ ایک عارضی مہمان کی حیثیت سے کسی غیر کے مکان پر گھڑی دو گھڑی وقت گزارنے کے لئے جاتا ہے۔ اس کے ضعیف باپ پر فالج گرا۔ وہ ایک دفعہ اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔ مگر جب اس نے ایک لجاجت۔ آزردگی اور افسردگی سے بھری ہوئی آواز کو اس رقاصہ کے خلاف نصیحت کرتے ہوئے سنا تو اپ اس کی انتہائی حسرتوں کا آخری مقصد تھی تو وہ بیزار ہو گیا۔ جب ایک بڑے ملازم نے جس نے مختار کو گود میں کھلایا تھا اس کے کانوں تک ڈرتے ڈرتے یہ اطلاع پہنچائی

کہ اس کی بیوی دن رات رو رو کر اپنے حُسن اپنی جوانی اپنی زندگی کو ایک قبل از وقت موت
کی آغوش میں سپرد کر رہی ہے تو اس نے ایک تحیر آمیز تمسخر سے قہقہہ لگایا اور اپنی آزادی
کو اپنی کمزور زنجیروں میں پابستہ نہ پا کر بڑی مسرت، بڑی طمانیت کا اظہار کیا۔

ممتاز نے سگریٹ کو ایک آخری کش لے کر پھینک دیا اور بائیں ہاتھ سے ایک تپائی
پر سے جو صوفے کے قریب بائیں طرف رکھی تھی ایک گلاس اٹھایا۔ اس میں زعفرانی
رنگ کی شراب برف اور سوڈے کے پُرجوش بخارات سے دست و گریباں ہو رہی تھی۔ اس نے
اس گلاس کو کسی مدت کے پیاسے کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر بغیر رُکے۔ بغیر سوچے سمجھے
مُنہ میں الٹا اور حلق سے اُتار دیا۔ گویا وہ اتنا بے صبر تھا کہ کام و دہان کی وساطت کو بھی
برداشت نہ کر سکتا تھا۔ خُدا جانے اِس آب آتشیں نے اس کے اندرونی نظام پر کیا اثر
کیا کہ اس کی پیاس بجھنے کی جگہ بھڑکی اور اس نے پے در پے گلاس کو بھرنا اور اسی طرح خالی کرنا
شروع کر دیا

اب میز پر ایک خالی بوتل نظر آ رہی تھی اور ایک بھرا ہوا گلاس جو اس بوتل کا آخری سرمایہ
تھا اس کے ہاتھ میں تھا۔ مگر اب اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس کا چہرہ سُرخ تھا اُس کی
آنکھ کے سُرخ ڈورے آگ کی روشن تحریریں بن کر پُتلیوں کی سطح سے اُبھرے اُبھرے دکھائی دے
تھے۔ اُس کی سانس میں ایک غیر معمولی گرمی محسوس ہو رہی تھی بے شمار جلے ہوئے سگرٹوں
کا ایک انبار اس خاکستر داں میں جمع ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھا اور بجلی کے پنکھے کی کارگزاری سے
غیر مطمئن ہو کر اس کی رفتار میں اور زیادہ تیزی پیدا کرنے کے لئے دیوار لگے ہوئے بٹن کی طرف
بڑھا۔ وہ اُٹھنے کو تو اُٹھ چکا تھا مگر اس کے پاؤں کی تھرتھری اس کی عصبی کمزوری کا پتہ دے رہی تھی

وہ اِدھر اُدھر رکھی ہوئی کرسیوں، سائنوں اور الماریوں کا سہارا لے کر اپنی نشست تک پہنچنے کے لئے چلا۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ اس حلقہ تک پہنچے اس کی آنکھ ایک قد آدم آئینہ پر پڑی جو اس کمرے کے آتش دان کی دیوار کے ساتھ آویزاں تھا۔

اس نے ذرا ایڑھ کر اپنے آپ کو اس آئینہ میں دیکھنا شروع کیا۔ اس نے اپنے آپ کو پہچاننے میں ضرورت سے ذرا زیادہ دیر لگائی۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا اس کی جدوجہد اپنی آنکھوں کو آئینہ کی شفاف سطح کے کسی ایک مرکز پر جمانے کی سعی میں سرگرم تھی۔ وہ اپنے دماغ کو آئینہ میں اپنے عکس کی موجودگی کا یقین دلانے پر اصرار کر رہا تھا۔ پھر جب اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو اس کے چہرے پر ایک معزز فاتح کی سی، ایک حسین عورت کی سی طمانیت بخش مسرت ظاہر ہوئی۔ آج اُس نے اپنے لباس کے مختلف اجزا کو ایک پورا دن صرف کر کے منتخب کیا تھا۔ اور اس وقت اپنے جسم کے تناسب پر اس دن بھر کی محنت کو بارور ہوتے دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنی گردن پھرائی اور شراب کی خالی بوتل کو دیکھا۔ پھر آئینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس جسم کو جس سے بوتل خالی ہو چکی تھی اپنی آنکھوں کے عکس کی گہرائی میں تلاش کر رہا تھا۔ اس گم گشتہ سیلاب آتشیں کو اپنی آنکھوں میں ایک زندہ کیفیت میں موجزن پا کر اس نے اطمینان اور زندگی کی ایک سانس لی اور پھر اپنی حرکت کو اپنی نشست کی طرف جاری رکھتے ہوئے معمول سے زیادہ زور سے اپنے ملازم کو آواز دی

ملازم بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور ابھی اس نے مشکل سے "جی سرکار" کہا ہی

تھا کہ ممتاز نے اس کو موٹر تیار کرنے کے لئے حکم دیا۔ ابھی ملازم نے پیٹھ ہی پھرائی تھی کہ اس پر جلدی بہت جلدی کا تحکما نہ بار بار نہ پڑا جس کام کے لئے وہ آج صبح سے تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کو تکمیل تک پہنچانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس کے سامنے گوسدانی پر رکھا ہوا کلاک اٹھ بجا رہا تھا اور اب وہ ذرا سی دیر کا متحمل نہ ہوسکتا تھا۔ آہ یہ وقت۔ یہ رات اسے کتنی محسوس (کمبی) کا وشوں، کتنی حسرتوں کے بعد میسر آئی تھی۔ اس نے اس رات کو اپنے موجودہ وقت سے پہلے لانے کے لئے کتنی پر اضطراب پر آرزو اور پر الام کوششیں کی تھیں آج کے سورج کو اس نے ہی دوران حیات میں ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا شوق اس کی زندگی کے کیسے دنوں کو تاریک سے تاریک رات سے زیادہ تاریک بنا چکا تھا۔

یہ وہی رات تھی جس کی آرزو کی خاکستر میں ہزاروں عشاق دفن ہو گئے یہ وہی رات تھی جس کے حصول کی تمنا عشق کی تربیت کا موجب ہوتی ہے۔ یہ وہی رات تھی۔ جس کا شوق کڑی سے کڑی منزل کو آن واحد میں طے اور مشکل سے مشکل مہم کو ایک اشارے میں سر کرا دیتا ہے۔ یہ وہی رات تھی جس کی امید زندگی کی تلخیوں کو شیریں درد ہجر کی مصیبتوں کو خوبصورت شوق کی ناکامیوں کو خوشگوار بنا دیتی ہے یہ وہی رات تھی جو خداوندی قانون کی پابندیوں کے ساتھ۔ قدرت کا بہترین تحفہ۔ ایک عورت اور مرد کی محبت کا خوشترین ثمر انبساط جسمانی کا اعلیٰ ترین معراج ہے۔ یہ وہی رات تھی۔ جو حکم خداوندی کے بغیر شیطان کا سب سے مہیب آلہ۔ اخلاقی ذلت کی سب سے اسفل گہرائی۔ عورت اور مرد کی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے

آج ممتاز اسی محبت کے زندہ اور متحرک بت کو اپنے پہلو میں محسوس کرنے۔ اپنے سوں

کے مبسکر بفرار کو اسی آنکھوں سے دیکھے اور اس حدسے کو تکمیل تک پہنچانے جا رہا تھا جس نے اس کی نظر میں دنیا کے سب سے بڑے گناہ کو ثواب۔ سب سے بڑی برائی کو ایک نیکی سب سے بڑی اخلاقی کمزوری کو ایک اخلاقی جرأت کر دکھایا تھا۔

(۲)

وہ موٹر کے انتظار میں اسی مخملی دیوان پر جس کو اس نے ترکی وضع کی نقل میں اپنے کمرے کی سب سے حسین زیب سار رکھا تھا۔ لیٹ گیا اب وہ اس بڑی کشمکش کے بعد جس سے وہ تھک گیا تھا۔ ذرا آرام کرنا چاہتا تھا۔ یہ چند لمحوں کی فرصت غنیمت تھی۔ اس نے پاؤں سامنے کی کرسی پر رکھ کے اپنے سر کو ایک نرم اور روئیں دار مخمل کے گاؤ تکیے کا سہارا دیا روئے کے بعد بچہ بہت جلد سو جاتا ہے۔ جسمانی درد کے بعد دماغ بہت جلد تسکین پاتا ہے۔ طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر غیر معمولی سکون نظر آتا ہے۔ اس کا دماغ بہت سی تکلیفوں سے تھک چکا تھا۔ اس کا جسم آج دن بھر کی محنت سے تنگ آچکا تھا۔ اس کے اعصاب شراب کے جوش اور حدت سے اپنی انتہائی کشاکش کر چکے تھے اس نے اس وقت یہ دیوان معمول سے زیادہ آرام دہ۔ یہ گاؤ تکیہ ضرورت سے زیادہ نرم۔ یہ چند لمحے بہت سے دنوں سے زیادہ کارآمد محسوس کئے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں دیوان۔ گاؤ تکیہ اور مخمل کے ایجاد کرنے والے دماغوں کی ذہانت کی تعریف کر رہا تھا۔ اس ملازم کی سستی کو جسے موٹر تیار کرنے کے لئے حکم دیا گیا تھا کچھ زیادہ معیوب نہ سمجھنے کے لئے بہانے سوچ رہا تھا

اتنے میں اس نے ملازم کو دروازے سے داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے

کانوں نے "سرکار موٹر تیار ہے" کی آواز سنی۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور دروازے سے باہر نکل کر موٹر پر سوار ہو گیا۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ اس نے محسوس تک نہ کیا۔ کہ اس کے سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں لکڑی ہے یا نہیں۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی۔ کیونکہ آج تک ان دو چیزوں کے بغیر وہ کبھی گھر سے باہر نہ نکلا تھا۔ اس کو اس امر کا احساس ضرور ہوا کہ شاید آج وہ ملازم کو اپنے سامنے سے ہٹانے یا بند دروازے کو کھولنے کے بغیر ان میں سے گزر گیا۔ آج ہر ایک چیز نے کچھ ایسی شفاف، آبی بخارات کی سی لطیف کیفیت اختیار کر لی تھی۔

موٹر منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ مگر آج خُدا جانے کیا بات تھی کہ وقت اور فاصلہ اپنے فطری خواص کے استعمال سے عاجز تھا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ وہ کب چلا اور کب پہنچا۔ یا یہ راستہ کیسے طے ہوا۔ اس کو موٹر بیٹھنے اور پھر موٹر سے اُترنے کے سوا۔ اور کچھ یاد نہ رہا۔ کیا ان دونوں کی حرکتوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا کچھ وقت صرف نہ ہوا تھا۔ یا اس کا دماغ اس وقت فاصلہ اور وقت کی سی کثیف اور مادی اشیاء کے نقوش کو اخذ کرنے سے قاصر تھا؟

وہ موٹر سے اترا۔ اور ایک بہت سی روشنیوں سے روشن بازار میں تھوڑی دور چل کر ایک خوبصورت، بلند اور وسیع مکان کے دروازے پر رُکا وہ دروازے کے اندر پاؤں رکھنے ہی کو تھا کہ کسی آواز نے جو اس کے دماغ سے یا دل سے یا جسم کے ہر روئیں سے نکلی۔ اس کے متحرک جسم کو ایک لمحہ کے لئے ساکن کر دیا انسان کی فطری نیکی نے اپنی موت سے پہلے زندگی کے لئے آخری کشمکش کی۔ اخلاق

نے اپنے وقار کی حفاظت کے لئے آخری تدبیر کی۔ حواس نے اپنی صحت کا آخری ثبوت دیا۔ ضمیر نے اس رشتہ کو ٹوٹتے دیکھ کر جو بندے کی گردن کو مالک کی مرضی کے ساتھ وابستہ رکھتا تھا۔ اس کو بچانے کے لئے آخری جدوجہد کی۔ مجروح شرافت نے آخری سانس لی وضعداری سربازار بے شمار دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ذلیل ہو کر تڑپی۔ اس کے نظام عصبی نے۔ اس کے قوائے جسمانی نے ایک زلزلہ محسوس کیا۔ اس کے دماغ کی سلطنت میں بغاوت ہوگئی۔ ممتاز نے سب کچھ دیکھا سب کچھ سنا اور پھر اپنی آنکھوں پر خواہشوں کی پٹی باندھ کر اپنے کانوں میں ہوس کا پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر اپنے ضمیر کا گناہ کے آہنی پنجہ سے گلا گھونٹ کر ایک جست بھری۔ اور اس برقی روشنی سے روشن۔ موسیقی کے نغموں سے لبریز۔ حسن کے کرشموں سے مسحور مکان کے اندر داخل ہوگیا۔

اس مکان کی منور و درخشاں فضا میں ایک برقی روشنی سے زیادہ روشن بجلی چمکی۔ ممتاز کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے اپنے آپ کو یک لخت کسی بڑے تصادم سے رکتے ہوئے یا شاید اس کے زور اور رعب سے مرعوب ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ کر سنبھلتے ہوئے محسوس کیا۔ .... ایک حسن سے زیادہ حسین، نور سے زیادہ منور، خوشبو سے زیادہ معطر چہرہ اس کے حسرت مند لبوں کے قریب ایک خطرناک قربت پر آ کے رک گیا تھا۔ سفید رنگ کے نازک۔ شفاف اور نرم ریشم کی باریک تہ میں سے جھلملاتے ہوئے دو بازو جن پر سیاہ اور سنہری رنگ کی آمیزش سے نکھرے ہوئے، لمبے اور پُرپیچ بال بیقرار تھے۔ اس کی آغوش میں الجھ گئے تھے۔ اور دو روشن، بڑی اور نیم وا آنکھیں مُسکرا مُسکرا کر اس کی آنکھوں سے ایک خاموش مگر عام فہم زبان میں کچھ ایسی باتیں کر رہی تھیں جن کو اس کا دل سن سن کر سمجھ سمجھ کر مسرور ہو رہا تھا۔

انہی آنکھوں کے پُر کیف جذب سے کھینچ کر، انہی بازوؤں کے الجھے ہوئے جال میں پھانس کر، انہی باتوں کی کشش سے متاثر ہو کر، وہ ایک کمرے میں جس کے کھلے ہوئے دروازے درمیانی صحن کے دائیں کونے میں لاکھوں دلربائیوں کے جادو جگا کر ہر تشنہ لب ارماں کو تکمیل حسرت کی دعوت دے رہے تھے پہنچ گیا۔ . . . .

اس رات کے بعد کئی راتیں آئیں اور گزر گئیں۔ کئی دن پیدا ہو ہو کر کتم عدم میں چھپ گئے۔ دن مہینوں میں۔ مہینے برسوں میں تبدیل ہو گئے۔ بچے جوان۔ جوان بوڑھے ہو گئے۔

زمانے کے ساتھ اہل زمانہ کے خیالات۔ وقت کے ساتھ لوگوں کی صفات تبدیل ہو گئیں۔ پیدا ہو ہو کے فنا ہوتے والی فنا ہو ہو کے زندہ ہونے والی دنیا کے ساتھ سلسلہ حیات و ممات بدل گیا۔ مگر ممتاز کے جذبات میں کوئی تبدیلی۔ کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ وہ اسی طرح اس ساحرہ کے سحر سے مسحور۔ اس قاہرہ کے حکم سے مجبور ہو کر اپنی جوانی اپنی صحت۔ اپنی دولت حسن و ناز کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھاتا رہا

اس عرصہ میں ایسا زمانہ بھی آیا جب ممتاز نے دنوں تک۔ مہینوں تک اس مکان کی اندرونی دنیا کے سوائے بیرونی دنیا کی کسی چیز کو نہ دیکھا۔ کیا اس نے ساری دنیا کا ماحصل اس محدود چار دیواری کے اندر حاصل کر لیا تھا۔ یا دنیا نے اس کو اپنی وسیع نعمتوں کے خلاف بغاوت کرتے دیکھ کر اس زندان میں محبوس کر دیا تھا۔

اس تمام عرصہ میں وہ اگر سوتا تو صرف اس لئے کہ وہ غارت گر دین و ایمان اس کو خواب میں نظر آئے۔ اگر بیدار رہتا تو محض اس لئے کہ اس بیدادگر کو اپنی آنکھوں کے سامنے مشق ستم کرتے دیکھے جب وہ کسی بات پر بگڑ جاتی تو وہ اپنے دل کی حسرتوں

کو اپنی جوانی کے ولولوں کو، اپنی زندگی کی امیدوں کو آنسو کے ایک قطرے میں منجمد کر کے اس کے قدموں پر گرا دیتا۔ جب وہ من جاتی تو لپنے شوق کو، اپنے اضطراب کو، اپنی خود فراموش عقیدت کو اپنے سر کی ایک جنبش میں متشکل کر کے اس کے پاؤں پر نچھاور کر دیتا۔

ایک شب وہ اس حسن فروش کی آغوش میں بے خبر پڑا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کی ناگہانی موت کی خبر سنی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کو جس نے مرنے والی کے جائز حق کو ایک جابر ملک گیر کی طرح غصب کر لیا تھا فاتحانہ مسرت سے مسرور دیکھ کر مطمئن ہوگیا

ایک دن جب وہ اس مکان کی ہر پابندی سے بے پروا آزادی سے بیزار ہو کر اس عورت کے لئے جس پر اب وہ ایک واحد مالک کی حیثیت سے قبضہ کرنے کا متمنی تھا، جس کو اب وہ اپنے سوا کسی اور کی آنکھوں سے دیکھا جانا بھی پسند نہ کرتا تھا ایک علیحدہ عشرت منزل بنانے کی فکر میں تھا۔ اس کے لئے بہت سے نقشوں پر جو اس کے دماغ کے منظر گاہ پر باری باری منتقش ہو ہو کر محو ہو جاتے تھے غور کر رہا تھا اور ان کے نقشوں کی تکمیل کے لئے اپنے محاصل کو ناکافی پاکر خیال ہی خیال میں اپنے باپ کی جمع کی ہوئی دولت کو ایک خود غرض لالچی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بند اور سربمہر لفافے کو کھول کر، جس کو ابھی ابھی ڈاکئے نے اس کے ہاتھ میں دے کر رسید حاصل کی تھی، اپنی آنکھوں سے یہ پڑھا کہ اس کے باپ نے اس کی روز افزوں بدکاریوں سے تنگ آکر، اس کو ایک دن بھی پہلے سے بہتر نہ پاکر اپنی جائداد سے محروم کر دیا ہے۔ اس کے دماغ پر ایک دھکا سا لگا مگر جب اس نے آنکھیں اٹھا کر اس

عورت کو جس کے استعمال کے لئے وہ اس دولت کو پیار کرتا تھا۔ اسی طرح مسرور اسی طرح مطمئن۔ اسی طرح اپنے قبضہ میں پایا تو وہ ایک بوڑھے شخص کے کمزور ارادے پر۔ ایک باپ کے بہت جلد فرو ہو جانے والے غصّہ پر ہنسا اور باتوں میں مشغول ہو گیا۔

ابھی اس کے پاس اپنی محنت سے کمائی ہوئی۔ اپنے مصارف سے بچا کر جمع کی ہوئی دولت تھی۔ اگرچہ وہ کئی بار یہ سمجھنے کی بے کار کوشش کرنا چاہتا تھا کہ یہ دولت بہت دیر تک اس کے موجودہ اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ابھی اس کو اس بات کی تسلّی تھی کہ اس کا مایوس باپ اس کے لئے اس خوبصورت اور آراستہ مکان کے دروازے بند نہیں کر سکتا جس کو وہ ہمیشہ "میرا خوبصورت دفتر" کہہ کر پکارتا تھا اور جس کو اسنے اپنے روپے سے اپنے نام پر خریدا تھا۔ اس کی بیوی کی موت، دولت کے نقصان، باپ کے غصّے بہن کی مایوسی کا کچھ احساس نہ ہوا۔ کیونکہ وہ عورت جس کی محبت سے بھری ہوئی ایک نظر میں وہ اپنے دل کے تمام جذبات کو مرکوز کئے ہوئے تھا۔ اس پر مہربان تھی، اس کے پہلو میں تھی، اس کی تھی، وہ دنیا کے تمام رشتوں کو تمام تعلقات کو، تمام چیزوں کو صرف اسی ایک عورت کی وساطت سے محسوس کر سکتا تھا۔ وہ عورت ایک رنگین چشمہ تھی جس نے ممتاز کی نگاہ میں دنیا کی ہر چیز کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا تھا۔

(۱۳)

آخر ایک دن وہ بھی آیا جو قانون فطرت کے ہر گنہگار کے لئے موت سے زیادہ یقینی ہے جب اس کا تمام سرمایہ توقعات سے بہت پہلے ختم ہو گیا۔ جب اس کے لئے اس کے

خوبصورت دفتر کے دروازے اگر باپ کے غصے نے نہیں تو قرض خواہوں کی قرقی نے بند کر دیئے۔ آہ! اس دن کو اگر آنا ہی تھا تو ذرا پہلے آیا ہوتا۔ جب ممتاز تندرست تھا۔ جب اس کا دماغ صحیح تھا۔ جب وہ کام کر کے دولت کمانے کی قابلیت رکھتا تھا۔ مگر اس وقت وہ شہر کی سب سے زیادہ غریب پرور سرائے کے ایک تنگ و تار کمرے میں ایک شکستہ چارپائی پر لیٹا تھا۔ شراب نے جس کی کثرت اسی رقاصہ کی کوششوں کی شرمندۂ احسان تھی۔ پانی۔ چائے۔ طعام اور ہر قسم کی خوراک جس کا وہ عادی تھا جگہ لے لی تھی۔ دختر رز نے ممتاز کو اپنی اداؤں کا اس قدر متوالا بنا دیا تھا کہ وہ پیاس۔ بھوک۔ درد۔ غرض قوائے جسمانی کے ہر مطالبے کا علاج اسی کی عشوہ گریوں سے کرتا تھا۔ اور اب جب کہ اس کے پاس اس قیمت کے بغیر نہ ہاتھ آنے والے پانی کو خریدنے کے لئے حبہ تک نہ تھا۔ اب جب کہ اعصابی تشنج کے درد انگیز دردوں کی شدت کو مٹانے کے لئے اس کو اس کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر وہ اردگرد کے منظر کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔ وہ رات کو اسی کمرے میں سویا تھا جس میں آج سے بارہ سال پہلے ایک رات کو وہ بے شمار امیدوں کو آغوش میں لئے داخل ہوا تھا۔ مگر آج صبح بیدار ہو کر اس نے آپ اس سرائے کے کمرے میں اس بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دیکھا۔ اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر جب اس کو اس خوبصورت رقاصہ کی وفا کا خیال آیا جس کے پاؤں کی ایک حرکت نے بارہ سال گزرے اس کی آئندہ زندگی کا دستور العمل تحریر کر دیا تھا۔ اور جو ابھی ابھی یعنی اس وقت جس وقت کی یاد اس کے مختل دماغ میں سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ اس کو پنکھا کر کے پیار سے بھری ہوئی تسلی دے دے کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو وہ یہ تمام درد و تکلیف

یہ تمام احتیاج و افلاس یہ تمام مایوسی و ذلت بھول گیا۔

اس نے کسی قدر حیرت، کسی قدر مسرت اور کسی قدر نفرت سے ایک بند لفافے کو دیکھا جو اس کے دائیں ہاتھ کے قریب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نمایاں جگہ پر رکھا تھا۔ حیرت اس لئے کہ آج اتنے طویل عرصہ کے بعد ایک خط کی موجودگی نے اس کو اس امر کا پتہ دیا کہ وہ اب تک اسی دنیا میں زندہ ہے جس کے رہنے والوں کے ساتھ اس کو کبھی تعلق تھا۔ کیا کسی دل میں اس کی یاد اب تک باقی تھی کہ اس کا اظہار اس خاموش طریق سے کیا گیا تھا۔ مسرت اس لئے کہ شاید باپ نے بیٹے کی مصیبتوں کا حال سن کر اپنے فطری جذبے سے کام لیا ہے۔ اور اس دولت کو جسے اس کے غصے نے چھین لیا تھا۔ اس کی شفقت نے واپس کر دیا ہے۔ نفرت اس لئے کہ آہ یہ دولت اس وقت مل رہی ہے جب وہ اس کو استعمال کر کے حصول لذت کی قابلیت نہیں رکھتا اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لفافے کو اٹھایا۔ ہاتھوں سے زیادہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے اسے کھولا اور انگلیوں سے زیادہ کانپتی ہوئی نظروں سے اسے پڑھنا شروع کیا۔

"میں صرف دولت کو پیار کرتی ہوں۔ جب تک تمہارے پاس دولت تھی تمہاری تھی اور اب ان کی خاطر جن کے پاس دولت ہے تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑتی ہوں۔"

جو دماغ بیوی کی موت، باپ کی مایوسی، دولت کے نقصان سے نہ گھبرایا تھا۔ اس عورت کی دائمی جدائی کی خبر سُن کر جس کی موجودگی میں دنیا بھر کی تکلیفیں راحتوں سے زیادہ دل پسند تھیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ آنکھیں کھول دیں

اور ایک انتہائی اضطراب سے مضطرب ہو کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی ۔

اس کی آنکھوں سے ایک ہولناک خواب کی جانکاہ کاوش ظاہر تھی۔ اُس نے آنکھوں کو اور زیادہ کھول کر کلاک کو دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے ۔ ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر پھر یاد دلایا" سرکار موٹر تیار ہے ۔"

آہ ! ان تین گھنٹوں کی غفلت میں اس نے کیا کیا دیکھ لیا۔ کیا یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔ اس نے اپنے آرام دہ دیوان کو۔ اپنے دفتر کے آراستہ کمرے کو اپنے ملازم کی مودب یاددہانی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے دماغ پر زور دیا . . . .

اور پھر کسی جائے نماز کی ضرورت کو محسوس کرنے کے بغیر کسی مسجد کو تلاش کرنیکے بغیر اس نے اسی کمرے کے فرش پر گر کر سر سجود کو اس فیاض درگاہ پر جھکا دیا۔ جس پر سر سجود خم کرنے والے کبھی ناامید نہیں رہتے۔ اُس کی آنکھوں سے شکریہ اور احسانمندی سے بھرے ہوئے دو بڑے آنسو نکلے۔ وہ اٹھا بہت سنجیدگی سے اپنی ٹوپی سر پر رکھی۔ لکڑی ہاتھ میں لی اور دروازے سے نکل کر موٹر پر سوار ہو گیا۔ جب موٹر ڈرائیور نے منتظر اور متجسس نگاہوں سے منزل مقصود کا پتہ دریافت کرنے کے لئے اس کی طرف دیکھا تو اس نے صرف یہی کہا گھر چلو، جلدی بہت جلدی۔"

آج وہ پورے ایک مہینے کے بعد ایک افسردہ باپ، ایک مایوس بہن، ایک منتظر بیوی کے پاس جا رہا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا۔ اس کی رفتار سے کچھ پریشانی اور بہت زیادہ خوشی ظاہر تھی۔ اندر جاتے ہی اس نے اپنی بیوی کو جو شاید اس وقت بھی اسی کے انتظار میں بیدار اور اسی کی یاد میں اشکبار تھی سینہ سے لپٹا لیا۔ آنسو بہہ کر گناہ کے داغوں اور دل کے شکووں کو دھو رہے تھے ۔

محبت کی دیوی

۱

زمین خدا جانے کتنی بار آفتاب کے گرد تصدق ہو چکی، معلوم نہیں چاند کتنی مرتبہ کرۂ ارض کی اوٹ سے اپنی پیشانی کا ملال دکھا دکھا کر غائب ہو گیا اور زمین کے بخارات نہ معلوم کتنی دفعہ فضائے آسمانی میں ابر بن بن کر قطرہ زن ہوئے۔ لیکن رادھا نے جو عزلت نشینی اختیار کر لی، وہ اسی طرح قائم رہی اور دسیل کے کسی مندر میں پوجا کرنے کے لئے وہ کبھی نہیں آئی۔

صبح و شام، مندروں کے گھنٹے اب بھی ہوا میں گونجا کرتے ہیں، دسیل کی آبادی اب بھی بدستور اپنی پرخلوص پیشانیوں کو بودھ کے مقدس استھان کے سامنے گھستی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن رادھا پھر اپنے مکان سے نہیں نکلی اور مندر میں آنے والا ہر نوجوان یہ محسوس کرنے لگا کہ آسمان کی اُس البنۃ الجمال (زہرہ) کی طرح، جو چہرہ پر ایک بار نقاب ڈال لینے کے بعد، افقِ مغرب کو اک زمانہ دراز کیلئے بے نور بنا جاتی ہے، اب شاید رادھا بھی نظر نہ آئے گی۔

نغمہائے پرستش، معبد کے در و دیوار سے اب بھی صدائے بازگشت پیدا کیا کرتے ہیں، چنگ و رباب کے تار وہاں کی فضا میں اب بھی اپنی لرزشوں کو موسیقی میں تبدیل کرتے رہتے ہیں، لیکن اک رادھا کے نہ آنے سے جو ادا سی وہاں کی فضا میں پیدا ہو گئی ہے، گو اُس کا علم بودھ کے پجاریوں کو نہ ہو۔ لیکن دسیل کا ایک ایک نوجوان اِس کا زخم اپنے دل میں لئے ہوئے ہے۔

۲

آفتاب غروب ہو رہا ہے اور قریب کی پہاڑی جو بارش کے اثر سے مزین ہو چلی ہے، ان گلہ بانوں

کی بانسریوں سے جو اپنا وہ اجی راگ قدرت کے اس شاداب چراگاہ کو سنا رہے ہیں ممو ہے۔

رادھا اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی اس منظر کو دیکھ رہی ہے اور اس طرح متحیر ہے گویا وہ ایک بُت ہے، جسے یونان کے عہد زریں میں یہاں نصب کیا گیا تھا اور اب اُسکی پرستش کرنے والے دُنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ اس کی صورت سے عشق کا ایسا سوگ ٹپک رہا ہے، محبت کا وہ سوز ظاہر ہو رہا ہے، گویا کہ وہ اندر ہی اندر بہتی ہوئی جا رہی ہے اور دنیا میں اس رسم کا دیکھنے والا اور اس نوجوان غمزدہ لڑکی پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہے۔

رادھا، دیبل کی اُن چند لڑکیوں میں سے تھی، جن کے حُسن کی داستانوں سے وہاں کی کوئی رنگین محفل خالی نظر نہ آتی تھی، لیکن رادھا اسلئے زیادہ تباہ کن تھی، کہ اُس کے حسن کے ساتھ کوئی آرزو وابستہ نہ ہو سکتی تھی، اور وہ اپنی سیرۃ کے لحاظ سے اس قدر بلند تھی کہ ایک انسان کا اس سے محبت کرنا، گویا ملاءِ اعلیٰ کی کسی مخلوق سے محبت کرنا تھا، اس لئے جبتک وہ ایک مندر میں آتی رہی۔ ایک دیوی ہی کی طرح اُسکی عزت کیگئی اور جب اُس نے آنا ترک کر دیا تو کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ اُس کے مکان تک جائے۔ کیونکہ ایک دیوی کے خلوتخانے میں کسی انسانی ہستی کا گذر نہیں ہو سکتا۔

۳

" اے پرماتما، میں کیا کروں؟ میں اُس شرم کا اظہار کیوں کر کروں، جو تیرا نام لیتے ہی میرے سارے جسم کو ایسا بنا دیتی ہے، جیسے بید کی وہ نازک ڈالی جو ہوا کا ہلکا سا جھونکا گذر جانے کے بعد بھی گھنٹوں تھرتھرایا کرتی ہے، کانپا کرتی ہے، لوگ کہتے ہیں رادھا نے تیری پوجا چھوڑ دی ہیشک چھوڑ دی، لیکن انہیں کیسے یقین دلاؤں کہ رادھا اب تیرا نام لینے اور تیرے سامنے سر جھکانے کے قابل نہیں رہی۔

اپنے دل میں اب جس آرزو کی پرورش میں کر رہی ہوں اُسکا تعلق اسی جسم سے ہے،

جسے میں نے تیرے لئے تج دیا تھا۔ مگر وہ آرزو تجھ سے علیحدہ ہے۔ پھر جس نے تیری پرستش اس طرح کی ہو کہ جس کے ساتھ اس کی روح بھی تیرے روبرو جھک جائے، وہ کیونکر تیرا نام لے سکتی ہے، جبکہ دل میں تیرے سوا کسی اور کی مورت موجود ہو اور روح تیرے علاوہ کسی اور صورت کے لئے بیتاب۔

میں جانتی ہوں کہ تو میری پرستش کا محتاج نہیں، تجھ پر قربان ہونے کے لئے مجھ سے زیادہ اچھی روحیں موجود ہیں، لیکن میں اپنے دل کے اس درد کو کہاں لے جاؤں، جو تیری جدائی سے پیدا ہو گیا ہے۔ اے پرماتما، یہ کس کا عذاب ہے کہ میں تجھ سے جدا ہو سکتی ہوں اور نہ مل سکتی ہوں یہ کس آگ میں تو نے مجھے ڈال دیا ہے جو مجھے نہ جلاتی ہے نہ آزاد کرتی ہے۔

وہ دن جب تیرے استھان پر، تیرے پوجاریوں کی قربانی ہو رہی تھی، اور میں بھی اس خیال سے اس شخص کی طرح، جس نے کوئی تیز شراب پی ہو مست و مخمور تھی۔ کہ عنقریب کسی ظالم کی تلوار میرے سینے بھی تیر جائیگی اور میں اپنی حیات کا آخری قطرۂ رنگین تیرے حضور میں پیش کر سکوں گی۔ آہ، وہ وقت میں کبھی نہیں بھول سکتی، جب اسی حال میں ان ظالموں کے سردار نے دفعتہً آکر اس خونریزی کو روک دیا اور اُسکو دیکھتے ہی میرا وہ سجدہ جو تیرے لئے زمین بوس تھا، چپکے ہی چپکے، اس کی حسین ظالم صورت کے لئے منتقل ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تو نے اپنے آسمان سے اُٹھا کر مجھے نیچے پھینک دیا۔ اپنے تخت الوہیت سے گرا کر زمین کے نہایت گہرے عمق میں گرا دیا، لیکن روح پھر بھی اسی کے لئے سربسجود تھی اور تجھے بھول جانے اور تجھ سے جُدا ہو جانے پر زیادہ مغموم نہ تھی۔

لیکن اے پرماتما، میں تیرا احسان کیونکر بھلا سکتی ہوں کہ اس پر بھی تو نے مجھے بچا دیا ورنہ میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ اس کے سامنے ایک بار بے حیا بن جاتی، اور محبت کی وہ تمام لذتیں حاصل کر لیتی، جن کے لئے میں اب بھی ویسی ہی بیقرار ہوں، جیسی کبھی تیرے قدموں میں ہوا کرتی تھی۔ پھر

جبکہ تو نے میری ناپاک ہستی پر اتنا کرم کیا، تو کیا اس کو اور زیادہ وسیع نہیں کر سکتا۔ کیا تیری انگلیاں میرے دل سے اس محبت کو نکال کر پھینک نہیں سکتیں، جس نے تیری، تیری پرستش کو چھین لیا ہے، میں راضی ہوں اگر اس محبت کا نکلنا، جان کا نکلنا ہو اور اس خلش کا دور ہونا، جسم سے روح کا جدا ہو جانا ہو۔

مہینوں ہو گئے کہ صبح و شام تیرے مندر کے گھنٹوں کی آواز سن سن کر کانپ کانپ اٹھی ہوں، اک زمانہ ہو گیا کہ روز تیرے استھان پر جا کر جان دینے کے لئے تڑپ تڑپ گئی ہوں، لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں میرے ناپاک قدم تیرے مقدس معبد کو خراب نہ کر دیں، کہیں تو اس گستاخی سے برہم ہو کر، میرے دل کے اندر وہ جذبہ نہ پیدا کر دے جو ایک عورت کے دل سے پاکدامنی کی طرف عزت کو محو کر دیتا ہے۔ اے پرمیشور، رحم کر اور محبت کے اس طوفان کو جس کی لہروں پر میں نے اپنی نازک اور ٹوٹی ہوئی کشتی اس قدر بیرحمی سے ڈال دی ہے، دور کر دے۔ تیرے غصے کی آگ میں جل جانا مجھے منظور ہے۔ لیکن اس طوفان کی موجوں میں اپنی لاش دفن کرنا مجھے گوارا نہیں۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب میں اس کافر کی صورت و سیرۃ میں ہزاروں عیب نہ نکالتی ہوں، میں دل کو ہر طرح سے یقین دلاتی ہوں کہ اس کی آنکھیں خونخوار ہیں، اس کی فطرت جفاکار ہے، اس کی چتون غضب آلود ہے اور اس کی ساری ہستی ناپاک و مردود، لیکن عین اسی وقت جبکہ میں یہ سب کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، دل تڑپ کر خون کی ایک گرم موج میرے تمام شرائین میں دوڑا دیتا ہے اور میں اس شراب کے نشہ سے مغلوب ہو کر پھر اسی کو پوجنے لگتی ہوں جس کو ذلیل سمجھنا چاہیئے۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکتی۔

پھر تو ہی بتا کہ اس جنگ میں کب تک مصروف رہوں اور کیونکر اپنی شکست کی لذت

کو محو کردوں"

(۴)

رادھا پر اس حال میں چند مہینے اور گذر جاتے ہیں اور اُس کی محبت حرارت کی اس منزل تک پہونچ جاتی ہے جسے مصطلحات علم الکیمیا میں درجہ بیاض سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کے بعد کائنات کی ہر چیز، صرف دُخان ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ حقیقت ہے کہ محبت، جو کیصورت میں اس کے دل کے اندر متمکن ہوئی تھی، اس کے لئے رادھا کا ہر تنفس ہوا کا جھونکا ثابت ہوا یہاں تک کہ چند ماہ کے اندر وہ چنگاری استعال والتہاب کے تمام مدارج طے کر گئی، اور اب اس کے لئے صرف یہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ کسی دن اپنے جھونپڑے کے گوشہ میں خاکستر کا ڈھیر نظر آئے یا اک آہ ہو کر ہوا میں لمجائے۔

اس کی غریب بیوہ ماں نے، علاج وچارہ سازی میں پوری کوشش صرف کردی، جس حد تک اسکا افلاس اجازت دے سکتا تھا، اسنے کوئی دقیقہ اس کوشش میں نہ اٹھا رکھا کہ دسیل کا یہ چاند گہن سے نکل جائے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی اور رادھا روز بروز نڈھال ہی ہوتی گئی، گویا وہ اک شمع صباحی تھی جس کے مضمحل شعلے، صرف حلقۂ شمع دان ہی کے اندر سے کچھ کچھ نظر آتے ہیں۔

اسکا جسم جو پہلے بھی بہت نازنین تھا، اب خطرناک حد تک نازک ہو گیا تھا اور اس آبگینہ نے اب حباب، ایک نہایت ہی نازک حباب کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اسکا وہ رنگ جو کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ جلد کے نیچے پگھلا ہوا سونا دوڑ رہا ہے، رفتہ رفتہ زعفرانی زرد، اور سفید ہو کر اب ایسا نظر آتا تھا گویا رادھا کوئی چاندنی کی مورت ہے جس پر پارہ کی صیقل کردی گئی ہے۔ اس کی لانبی لانبی گھنی پلکیں جو حسین آنکھوں پر چار شف

کے سیاہ ریشمی نقاب کی طرح پڑی رہتی تھیں۔ اس کی خوبصورت لانبی گردن، جس کی صباحت
میں کوثر و تسنیم کا رنگ جھلکا کرتا تھا اس کا وہ جسم جو سینہ و کمر کے تناسب نشیب و فراز کو
پیش کرکے دنیائے جذبات میں خدا جانے کس قسم کا تلاطم برپا کر دیا تھا۔ اس کی وہ پیاری
پیاری پیشانی، جس کا صندل و عبیر ملکر ایک ملکوتی منظر پیش کیا کرتا تھا۔ اس کے وہ
لانبے لانبے بال، جو ہزاروں حلقے بناتے ہوئے الجھی ہوئی حالت میں بھی کمر کو عبور کر
جاتے تھے۔ اس کے وہ رخسار جن کو دنیا نے ہمیشہ شعلۂ بلورین سمجھا۔ اس کا وہ شباب
جس کے اندر کائنات کے تمام ستاروں کا شدید ترین طوفان اندر ہی اندر جوش
کھاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ الغرض رادھا اپنی ان تمام خصوصیات جمال کے ساتھ جنہیں
فطرت مشکل ہی سے کبھی کسی ایک ہستی میں جمع کر دیتی ہے، اسوقت غایت درجہ مضمحل
اور سوگوار تھی۔ لیکن باوجود اس کے اس کی آنکھوں کا، اُن آنکھوں کا جن کی کیفیت کو
دنیا کا کوئی لٹریچر قلمبند نہیں کرسکتا، یہ عالم تھا کہ بجائے نگاہوں کے اُن سے کہربائی
خطوط نکلتے ہوئے نظر آتے تھے اور اُن کی لمعانیت "تماشا سوز" حد تک بڑھ گئی تھی۔۔

(۵)

دہلی میں آج ماتم بپا ہے، ہر طرف حزن و ملال کے آثار نمودار ہیں اور ہر شخص بیتاب و
مضطرب ہے۔ دوکانیں بند ہیں، بازار کی چہل پہل موقوف ہے اور لوگ پریشان ہیں
کہ انہیں اب ایسا حکمران کیونکر نصیب ہوگا۔ دنیا میں کون ایسا ہے، جو ان کے ساتھ
اس رواداری کو جائز رکھے گا۔ ایسا فرمانروا جس نے باوجود اجنبی ہونے کے کبھی ہماری
پرستشوں سے تعرض نہیں کیا، جو ہماری ناقوس کی آوازوں سے کبھی چیں بجبیں نہ ہوا
جس نے ہمارے حقوق کبھی پامال نہیں کئے، جس نے ایک معمولی جزیہ کے عوض ہمیں

ہمارے جان و مال کی پوری حفاظت کی اور جو ہمیشہ ہمارے نزاعات کو ہمارے ہی مذہب کے مطابق فیصل کرتا رہا، اب دوبارہ نہیں آسکتا، فطرت اس راحت رسانی کی تکرار مشکل سے کرتی ہے۔

سندھ کے عامل کو گئے ہوئے مہینوں ہو گئے، اور اس کی عزت و عظمت کی یاد آخر کار اس صورت سے پرستارانہ جذبات میں منتقل ہو گئی، کہ برہمنوں نے اس کا بت تیار کیا۔ تاکہ روز صبح کو اس کے سامنے سر اعتراف جھکا کر اس کی روحانی برکات حاصل کر لیا کریں۔

رات کا سکون عالم کو محیط ہے، چاند دیبل کی خواب آلود آبادی پر اپنی شعاعیں ڈالتا ہوا گزر رہا ہے اور رادھا بھی آہستہ آہستہ سپید چادر اوڑھے ہوئے اک نورانی سایہ کی طرح اپنے جھونپڑے سے نکلتی ہے اور معبد عظیم میں داخل ہو جاتی ہے

۶

"اے میری روح پر ظلم کرنیوالے کافر انسان، اے میرے بدن میں محبت کی آگ پھونک دینے والے ظالم دیوتا، کیا خدا کی اس وسیع آبادی میں تیرے سوا اور کوئی نہ تھا، جس کی آرزو سے میں اپنے دل کو آباد کر سکتی۔ جس کی صورت میرے دماغ میں منقوش ہو جاتی۔

میں، کہ جس کے سامنے اگر صبح کا دیوتا بھی اپنی تمام نرم و خنک روشنیوں کے ساتھ اگر صرف ایک نگاہ لطف کا امیدوار ہوتا، تو کبھی کامیاب نہ ہو سکتا، میں، کہ جو شام کے دیوتا کو بھی صرف اس کی رنگین ملاعنتوں کی وجہ سے قابل توجہ نہ سمجھتی، میں، کہ جس کے روبرو قوس قزح کی رنگینیاں چاند کی سیم افشانیاں، پھولوں کی نکہت، بہار کی طلعت اور تمام وہ چیزیں جنہیں زمین و آسمان میں حسین کہا جا سکتا ہے، کوئی کشش و جاذبیت نہ رکھتی تھیں، تیری صرف ایک نگاہ حریف نہ بن سکی

اور اپنے سارے وقار کو اس طرح تیرے اوپر قربان کر دیا، جس طرح وہ کوئی سب سے بُری چیز ہو۔
دُنیا میں کیسے کیسے جوان، کیسے کیسے حسین موجود ہیں اور اس مندر کے اندر مجھے معلوم ہے کہ جب میں پھول چڑھانے آیا کرتی تھی، تو سرزمین دیبل کے کیسے کیسے نوجوان سورما، صرف اس انتظار میں گھنٹوں کھڑے رہا کرتے تھے، کہ شاید میں بھول کر ہی اُن میں سے کسی کی طرف دیکھ لوں، لیکن اس مقدس جگہ کا ایک ذرہ گواہ ہے، کہ میری نگاہ کبھی گھونگھٹ کے اندر بھی پلکوں سے باہر نہیں نکلی، کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ ان کو دیکھ لینا اُن میں کسی آرزو کا پیدا کر دینا ہے، جسکا پورا کرنا میرے اختیار میں نہ تھا۔

لیکن تو دفعتہً نمودار ہوا اور تو نے مجھے صرف ایک نظر سے اس طرح بے دست و پا کر دیا، جیسے کمند سے ہرن۔ میں نے اسی وقت چاہا کہ تو کوئی گستاخی کرے، میری جانب دستِ حرص دراز کرے اور میں تیرے اخلاق سے متنفر ہو کر تجھ سے بیزار ہو جاؤں اور اس طرح تیرے خیال کو دل سے نکال سکوں، لیکن مجھ پر کیسا شدید ظلم کیا، تیرے شریفانہ اخلاق نے کہ مندر میں مجھے لرزہ براندام دیکھتے ہی، تو نے اک نگاہِ "محبت فروز" تو ضرور ڈالی، لیکن اسکے بعد اگر تو نے مجھ سے بات بھی کی تو اس طرح، گویا تو مجھے شرافت و عزت کی دیوی سمجھتا ہے اور تجھ میں نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی بھی جرأت نہیں ہے۔ تو فاتح تھا تو اس وقت مالک تھا۔

اور اگر تو چاہتا تو دیبل کی ہر حسین لڑکی تیری خدمت کے لئے حاضر ہو سکتی تھی، چہ جائیکہ مجھ ایسی غریب و بے کس لڑکی، کہ اگر تو اُس وقت مجھے ذبح بھی کر دیتا تو کوئی تجھ سے میرے قصور کا پوچھنے والا نہ تھا، لیکن تو نے باوجود اسکے، کہ عنفوانِ شباب کے تمام جذبات تکمیل کے ساتھ تیرے ہر ہر عضو سے ٹپک رہے تھے، مجھ سے، جو شاید بجا طور سے اپنے حُسن و شباب پر ناز کر سکتی تھی، کوئی حیا سوز التفات نہیں کیا۔ پھر اُس وقت سے کہ تو نے مجھے حفاظت کے ساتھ میرے گھر تک

پہونچادیا، اس وقت تک کہ میں تیری حسین تصویر، تیری مقدس مورت کے سامنے سربسجود ہوں، تونے میری تلاش نہیں کی، حالانکہ مجھے تیری بھی بیقراری کا حال معلوم تھا، تونے مجھے کبھی بے حجاب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا، حالانکہ میں جانتی ہوں تو اس کے لئے کیا کیا تڑپا کیا۔ صرف اسلئے کہ تونے میری عزت کے مقابلہ میں اپنی تمناؤں کا خون کردینا آسان سمجھا اور تونے یہ کبھی گوارا نہیں کیا کہ لوگ رادھا کو بری طرح یاد کریں۔

میں ایک عمر تک پتھر کی ان مورتوں کے سامنے پیشانی گھستی رہی، لیکن حدود انسانیت سے ایک قدم بھی آگے نہیں رکھ سکی۔ تونے صرف ایکبار اپنا چہرہ دکھایا اور میں اس مقام تک پہونچ گئی، جہاں کسی دیوی کی بھی رسائی نہیں۔

پھر اب، جب کہ تو یہاں نہیں ہے اور شاید کبھی نہ آئیگا، میں سوائے اسکے اور کیا کرسکتی ہوں کہ جب تک زندہ ہوں صرف تیری ہی پرستش کروں اور ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالوں جو دُنیا والوں کو صرف پرستش اخلاق وشرافت کی تعلیم دے۔ تیرے لئے میری زندگی کے تمام آنسو صرف ہوچکے، میرے بدن کا ایک ایک بال تیرے لئے رو چکا، یعنی پرستش کی اُس معمولی منزل سے، جس سے ہر شخص واقف ہے، میں گذر چکی۔ پھر اب میں تجھے صرف روح ہوکر پوجنا چاہتی ہوں، کیونکہ تیرے احسان سے عہدہ برآ ہونے اور تجھ سے مل رہنے کی تمنا اب شاید اسی طرح پوری ہوسکتی ہے۔"

(۷)

صبح ہوتے ہی سارے دیبل کو معلوم ہوجاتا ہے کہ رادھا، جس نے مہینوں سے مندر کا آنا جانا ترک کردیا تھا، رات پوجا کے لئے آئی اور مرگئی۔ لوگ متحیر تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیونکر ہوا، مگر روشنی کے سامنے محمد قاسم کی وہ تصویر، جو اس سے قبل مضمحل نظر آیا کرتی تھی،

مسرور تھی، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے اندر کوئی روح دوڑ گئی ہے

نیاز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نازنا پیاری، تمہاری تحریر جو ایک ہی وقت میں نامۂ معذرت بھی تھی اور مکتوب متالم بھی، ملی۔
کاش میں تمہیں بتا سکتی، کہ تمہارے اس خط نے میرے خوابیدہ جذبات کے ساتھ کیا کیا۔ ہر چند اس کا اعتراف میں خود اپنی ذات سے بھی کرنا چاہتی تھی، لیکن اب میرے قابو میں نہیں کہ میں اس حقیقت کو مزید عرصہ تک راز بنائے رکھوں، کچھ تو اس لئے کہ میں اس درد دیرینہ کو اب چھپا نہیں سکتی، اور کچھ اس لئے کہ میرا یہ اقبال جرم تمہارے کرب روح کا بھی مرہم ثابت ہوگا۔ میں اپنی حیات معاشقہ کا افسانہ آج پہلی بار دہراتی ہوں؛ اگرچہ مشاغلِ زندگی سے فرصت، اس لئے نکالنا کہ ایک مردہ و مدفون محبت کا ماتم کیا جائے دشوار ہے۔

مجھے افسوس اس امر کا ہے کہ تم نے میری فطرت کا مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا، اور چونکہ میں دیکھتی ہوں کہ تمہاری فطرت مجھ سے بحدِ کمال مطابق ہے اس لئے میں نتیجہ نکالتی ہوں کہ تم اپنے تئیں بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکیں۔ تم نے اس خط میں لکھا ہے "کاش مجھے موت آسکتی"، اس لئے کہ اس نے تم سے بیوفائی کی۔ تم کہتی ہو "عورت کا دل پہلی ہی مرتبہ محبت سے بھر جاتا ہے اور پھر کبھی خالی نہیں ہوتا"، یعنی ایک عورت، صرف ایک ہی بار محبت کر سکتی ہے۔ تم میرے حیاتِ ازدواجی کی مثال پیش کرتی ہو، اس کی منقطع نہ ہونے والی برکات محبت کی طرف اشارہ کرتی ہو، تم سمجھتی ہو کہ میری حیات ازدواجی بالکل

تہارے داعیات کے مطابق ہے۔

پیاری نازو، یہ سب تمہارا خیال ہے۔ تم نے جو کچھ رائے میرے متعلق قائم کرلی ہے اور جن داعیات قلب کا اپنے اندر ہونا باور کرتی ہو ایک طلسم خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ نہ تو نوشابہ وہ نوشابہ ہے، جو نازلہ کے حجلہ خیال میں رہتی ہے اور نہ نازلہ وہ نازلہ ہے جس کا اسے خود یقین ہے۔ تاہم میں تسلی کرتی ہوں کہ ہم دونوں جذباتی ہیں اور ہماری فطرتیں صرف ایک ہی چیز کی طلبگار ہوسکتی ہیں اور وہ چیز "محبت" ہے۔

تاریخ عالم کی روایاتِ تعشق کو محض رومان نہ سمجھو۔ یہ افسانے صرف حقیقت ہی نہیں بلکہ حیات کی فریادیں ہیں۔ مصر قدیم کی فرمانروا کلیوپیٹرا جیسی صدہا عظیم ہستیاں آج کل کی عورتوں سے مختلف نہ تھیں، آج بھی ہر عورت جو اپنی فطرت کاملہ کے ساتھ زندہ ہے، کلیوپیٹرا ہے میں بھی وہی ہوں اور تم بھی وہی۔

یہ باتیں میرے خلوتخانۂ دل کے وہ راز ہیں، جنہیں اگر تم میرے سامنے ہوتیں، تو میں قیامت تک بھی زبان پر نہ لاسکتی، مگر اس وقت نہایت آزادی کے ساتھ لکھتی چلی جارہی ہوں۔ میں اپنی حیاتِ ماضی کے خزانے جو میرے دل کے اندر محفوظ تھے کھولے دے رہی ہوں، اور اگر تم نے ذرا غور و تامل سے کام لیا تو مجھے کامل یقین ہے کہ اس تحریر کے بعد تم اپنی فطرت کو بخوبی سمجھ سکو گی، اور معلوم کرلو گی کہ تمہاری زندگی اس سانحہ سے ختم نہیں ہوگئی ہے بلکہ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

غرض جو کچھ میں اوپر لکھ چکی ہوں یہ میرے سانحات عشقیہ کی تمہید تھی جو ناگزیر تھی۔ مجھے طول بیان کا اندیشہ ضرور ہے لیکن جانتی ہوں کہ تم اس سے مضمحل نہ ہوجاؤ گی

میری پہلی محبت تو مجھے خود اپنی ذات سے ہوئی اور دوسری مجھے اپنے والد سے (ماں کو میں نے دیکھا ہی نہیں)۔ میرا سن اس وقت ۱۶ سال کا تھا۔ پیاری نازو میں تم سے کن لفظوں میں کہوں کہ

جب میں ایک صبح پلنگ سے اُٹھ کر آئینہ کے سامنے گئی، تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی رعنائی سے خود عشق ہو گیا ہے، میں نے اپنے گیسوؤں میں عنبر کی بو سونگھی، لبوں میں التہاب عتیق کو گویا دیکھا، اور آنکھوں میں شباب کو متموج۔ میں اپنی نظروں میں خود ہی نہایت محبوب تھی اور مجھے اپنے نشۂ حُسن کا ایک متکبرانہ احساس تھا۔ میں متحیر تھی کہ ایک رات میں یہ انقلاب کیونکر پیدا ہو گیا! چونکہ میرے والد فلسفہ کے پروفیسر تھے اور اس میں انہیں حد درجہ انہماک و شغف تھا، یہی وجہ تھی کہ میری پرورش تمام تر طبعی تھی اور میری تربیت قطعاً فطری۔ فلسفہ میں چونکہ انہیں یونان قدیم کے فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی، اسی بنا پر وہ مجھے "نوسیکا" کہہ کر پکارا کرتے تھے . . . . . وہ سرو قامت شہزادی، جو دریا کے کنارے شاہانہ لباس میں غسل کے لئے جایا کرتی تھی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ گیند کھیلا کرتی تھی، یہاں تک کہ ایک دن اُڈیسیس سے مل گئی، جسے جہاز کی تباہی نے آوارہ کر کے وہاں پہونچا دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں اپنے تئیں فی الواقعی "نوسیکا" سمجھنے لگی اور میرے دل میں خواہش پیدا ہو گئی کہ جنگل میں نکل جاؤں، خوب گاتی پھروں، اور ایک دن اُڈیسس ایسی کسی آوارہ ہستی سے دوچار ہو جاؤں۔ میرے والد اپنی آنکھوں کی مسرور روشنی سے مجھے دیکھا کرتے تھے؛ میں سمجھتی ہوں کہ شاید وہ مجھے دیکھ دیکھ کر سوچتے رہتے تھے کہ دیکھوں یہ کہاں تک پرواز کر سکتی ہے؛ انہوں نے مجھے کبھی نصیحت نہیں کی، کبھی [illegible] کسی بات پر نہیں جھڑکا، اُن کے سر کا ایک جانب جھکے رہنا، محویت کے عالم میں [illegible] دیتے رہنا، غیر معمولی چمکدار آنکھوں کا اسرار عمیق کے انکشاف میں مصروف نظر آنا اور [illegible] دائمی تبسم و یکسر خاموشی اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

میری مسرت کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ ان سے سوال کرتی رہوں، وہ اپنے [illegible]

نہایت دیانتداری سے کام لیتے تھے، انہوں نے کسی بات سے تابیت نہیں ہونے دیا کہ وہ اس تمام ذخیرہ معلومات میں سے جو اُن کے پاس تھا، کوئی بات میری اطلاع کیلئے غیر مناسب و ناشائستہ سمجھتے تھے، میرے ساتھ ان کا برتاؤ بالکل مساویانہ تھا۔ میں نے ایک دن دریافت کیا ہو" انہوں نے جواب دیا۔" میرے خیال میں خُدا اس جذبہ کا نام ہے، جو تمہارے اندر طاقت (وسیع ترین معنوں میں) اور محبت کی خواہش کو پیدا کرتا ہے" نازو تم نہیں سمجھ سکتیں کہ اس جواب میں کس قدر حقیقت و واقعیت تھی، میرے دل میں اس وقت بھی جب میں اُن کا جواب سُن رہی تھی، اسی خواہش کا احساس تھا اور اب میں سمجھتی ہوں کہ عالم طفلی کی پُرسکون سطح سے ایک شخص کی ہستی (واقعی) اسی طرح طلوع کرتی ہے، جس طرح سطح بحر سے چاند۔ اور وہ ہستی اس لئے طلوع کرتی ہے کہ آفتاب کی شعاعوں سے لذت تپش حاصل کرے، ہواؤں کی چھپن میں میں انبساط پائے، ایک وسیع البسط دنیا کا وجود اس پر منکشف ہو جائے اور پھر مسحور تماشا آنکھوں کے سامنے وہ سرِ عظیم و عجیب جسے حیات کہتے ہیں، آجائے اس کے بعد سب میرے لئے ہے، "سب میرا ہے" کا ترانہ سازِ دل سے نکلنے لگتا ہے۔ جس وقت مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی تو میں بیتاب ہو کر چاہتی تھی کہ تمام عالم ساری فضا پر اپنی آواز کی انتہائی بلندی کے ساتھ اس راز کا انکشاف کرتی پھروں، پکارتی پھروں اور دنیا سے کہدوں کہ نادانو اگر دنیں ڈال ڈال کر کیوں غم کی تصویریں نظر آتے ہو، کیا تم فضا کو آگ کی بارش سے مملو نہیں دیکھتے، کیا تم آفتاب کو گلیوں اور راستوں میں مضطرب نہیں پاتے؟ دیوانو یہ تو سب کچھ تمہارے ہی لئے ہے، یہ سب ان کے لئے ہے جن کو خواہش ہے، تلاش ہے، گرسنگی ہے، زندگی کی بھوک، ہے!

میرے اعضاء کا نمو تکمیل کی جانب سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا یعنی میرا طوفان اب ساحل سے گذر جانا چاہتا تھا۔

میری اچھی نانا دلہ۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ ایسی حالت میں اس شخص کی محبت میں میرا غرق ہو جانا جو مجھے سب سے پہلے ملا کس قدر مطابق فطرت تھا۔ اور میرا اسے خدا سمجھ لینا کس قدر طبعی تھا۔ اگرچہ میرا خدا تو میری وہی "خواہش عظیم" تھی۔ اسی میرے اندر کے خدا نے ایک شدید و عظیم طلوع آفتاب کو اس لئے نمودار کیا کہ میرے موضوع محبت پر چمکے۔ اسے روشن کر دے اور اس کے موجود، اس کی ہستی کو سراسر انجذاب میں تبدیل کر دے اور میں اسکی روشنی میں اس ہستی کو پہچان سکوں۔ یہاں سے تم نتیجہ نکال سکتی ہو کہ الوہیت، محبت میں ہے نہ کہ محبوب میں۔

میرے والد گرمیوں میں مجھے بمبئی سے، نانا تھے ران لے جاتے تھے اور وہاں جانے میں اگر وہ ہر ممکن عجلت سے کام لیتے تھے تو واپس ہونے میں بھی تاخیر کا امکان ختم کر دیتے تھے، مختصر یہ کہ میرے سن شعور کا زمانہ تقریباً اسی پرفضا پہاڑ کی وادیوں میں گذرا، کیونکہ بمشکل سال کے تین مہینے بمبئی میں بسر ہوتے تھے۔ اُن کا مخفی منشاء دلی یہ تھا کہ ان کی بیٹی پروردہ مناظر ہو کر جئے

ہمارا مکان۔ اس نہایت مختصر پہاڑی اور آبادی کے کنارے پر اور سب سے علیحدہ تھا، جہاں مناظر قدرت کی بیگانہ وشی اور خودسری کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میرے والد ہر صبح، اپنے سیکرٹری کو لے کر کتب خانہ میں داخل ہو جاتے، دوپہر تک فلسفہ سے جنگ کیا کرتے تھے۔ میں اکثر ان کے اس تخلیہ و انہماک پر حملہ کر دیا کرتی تھی اور وہ میرے پہنچتے ہی میری طرف متوجہ ہو جاتے متبسم ہوتے اور پھر اپنے سیکرٹری پر ایک بیکسانہ نگاہ ڈالتے۔ میں یہ دیکھتی اور بھاگ جایا کرتی تھی سب مجھے بھلے لگتے پھرنے سے عشق تھا۔ میرے کالے اور لانبے بال ہوا میں اڑا کرتے، میں پھولوں کے ہار بناتی، اپنے تئیں طرح طرح سے سنوارتی اور پھر ان کو جھنجلا کر بکھیر دیتی تھی، چشمۂ رواں میں گھنٹوں تیرا کرتی تھی، الغرض مجھے چلانے، پکارنے اور گانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ میں آفتاب کے نور میں غسل کرتی، اپنے تئیں غرق کر دیتی اور افتخار مغرورانہ کے ساتھ اپنی زلفوں کو بنا بنا کر بگاڑتی اور گاتی رہتی، مگر میں ہر حالت میں ایک پیکر انتظار بنی رہتی تھی اور سوچتی تھی کہ جب وہ آئیگا تو مجھے اس طرح دیکھے گا

توکس قدر حیران و متعجب ہو گا۔ پھر مجھ میں تیقن کے ساتھ ہی شان استغنا پیدا ہو جاتی تھی اور میں سمجھتی تھی کہ اپنے ایک موئے زلف سے اس کے سنگین قویٰ کو باندھ لونگی، اپنی نیم صدائے تنفس سے اسے بے زبان بنا دوں گی اور وہ مسحور ہو کر رہ جائیگا۔ نازلہ، تم اس حالت کا تصور کر سکتی ہو؟ اگر تم میرے ساتھ ہم نوا نہیں ہو سکتیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ تم ایک پھول کو نکہت منتشر کرنے سے، اور ایک شہد کی مکھی کو اس پھول کی جاذبیت کا معمول ہو جانے سے روکنا چاہتی ہو۔

مختصر یہ کہ نازلہ اگر میں اپنے عالم شباب کی کیفیت و حسیات کو قلمبند کروں تو ایک ضخیم جلد طیار کر سکتی ہوں، مگر چاہتی ہوں کہ اب تم اس آدمی کا حال معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو گی، اس لئے میں تمہیں زیادہ بے چین نہیں دیکھنا چاہتی۔ لوسُنو، ہنسنا نہیں۔ وہ۔ وہ سیکرٹری ہی تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس وقت اپنے آپ میں نہ تھی۔ وہ چنداں دلکش نہ تھا، تاہم اس میں بعض باتیں محبت کی سفارش کرنے والی ضرور تھیں اور اس کا شباب سب سے بڑا نوید تعشق تھا، لیکن نہ وہ قطعی وحشی تھا نہ سخت متمدن۔ افسوس ہے کہ اس کی زندگی کے لمحات رنگین شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئے تھے۔

وہ فلسفہ کا جویا تھا، اس لئے متین و سنجیدہ تھا اور اسی مقصد سے میرے والد کے پاس آیا تھا اور پھر انہوں نے اسے اپنا سیکرٹری بھی بنا لیا تھا۔ جب وہ پہلے پہل اپنا کرمچ کا بیگ اُٹھائے ہوئے پہونچا تو میں اس پر خوب ہنسی، میں نے اُسے بے وقوف سمجھا

اس کا نام جمالی تھا۔ وہ چشمہ بھی لگاتا تھا، مگر اس سے اُس کے حسن میں کچھ اضافہ نہ ہوتا تھا، وہ خوبصورت نہ تھا، بلکہ کچھ بدصورتی کی طرف مائل تھا، جو کپڑے پہنتا اس میں بھی کوئی رعنائی پیدا نہ ہوتی تھی۔

ابتدائی ہفتہ میں تو میں غالباً اس کی توہین و تذلیل کرتی رہی، لیکن اس کے بعد میری

محبت کی شدت نہ پوچھو! اور حقیقت یہ ہے کہ حجازی پہلا نوجوان شخص تھا، جس سے میں ملی۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ بھبئی کا مختصر قیام، ماہم کی سکونت، میری والدہ کا نہ ہونا، اور والد کا معاشری طور پر مقبول نہ ہونا یہ سب باتیں میری تنہائی بیکسی کا باعث ہو کر رہ گئی تھیں؛ پھر اس کے علاوہ اُن کی محبت و تربیت میں خود بھی غیر معمولی طبیعت کی لڑکی تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ میرے احساسِ شباب کی عمر ابھی بہت ہی کم تھی ہر چند میرے والد کے پاس لوگ آیا کرتے تھے، مگر اُن میں میری جنس کا کوئی نہ تھا، قریب قریب سب کسی نہ کسی قسم کی وحشت میں مبتلا تھے، اور کسی نہ کسی خبط میں محو کوئی فلسفہ میں غرق تھا تو کسی کو آثار قدیمہ کی دُھن تھی۔ میں جھاڑیوں میں بیٹھ کر سوچا کرتی "کیا دنیا سے محبت کا چلن ہی اُٹھ گیا ہے؟" میں علمی نکات کی جویا نہ تھی، مجھے آثار قدیمہ کا خبط نہ تھا، میں نوشباب کی تلاش میں، خود اپنی جستجو میں، ایک ملتہب و ذی حیات جذبہ کے پالینے میں سرگرداں تھی، میں اس شریر لڑکے کو ڈھونڈھتی تھی، جس کے زریں کاکلوں میں حلقہ پڑے ہوئے ہیں، جس کا خمیر شعاع آفتاب سے کیا گیا ہے، کہ وہ اپنی شریر و خنداں آنکھوں سے مجھے نشانہ بنالے، اور اپنی کمان کا ایک تیر میرے دل میں بھی پیوست کر جائے"۔

ایک نہایت لطیف صبح، میں اپنی کھڑکی سے منظر کا لطف اُٹھا رہی تھی، برگ زار کوہ و دشت پر بے شمار شبنمی گوہر بکھرے ہوئے چمک رہے تھے۔ میں دیکھ رہی تھی اور گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس سہانے سماں نے مجھے دعوت دی، اور میں سبز رنگ کا لباس جسے میں نے خود ہی روایاتِ قدیمہ کے مطابق طیار کیا تھا، پہن کر جنگل کی طرف چلدی۔ برہنہ پا، برہنہ بازو، عریاں شانے، اور منتشر زلفیں، یہ میری اس وقت کی تصویر کے نمایاں خط و خال تھے۔ اس وقت مجھے کائنات سے عشق تھا، میں نے اپنے اندر ایک شعلہ کا التہابِ لرزاں محسوس کیا، جس کا مقتضا یکسر اغراق و محویت تھا۔ میں نے اپنے تئیں آزاد چھوڑ دیا

اور خود کو بھول گئی۔

پہلے میں ایک اندازِ رقص کے ساتھ چند قدم دوڑی، لیکن پھر یہ خیال کر کے میری آغوش تو ہنوز خالی ہے کچھ افسردہ سی ہو گئی

اس وقت میں اپنے اندر سے جذبہ کو باہر نکال لینا چاہتی تھی، کسی دوسری ہستی پر چھا دینے کے لئے، کسی خاص ہستی پر سارا کر دینے کے لئے میں نے نظر اٹھائی، تو جمالی سکان کی دیوار سے ٹکا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا، گھور رہا تھا۔ نگاہیں ملتے ہی وہ میری طرف متبسم ہوا۔ میرا خیال ہے کہ میرے رقصِ دیوانگی نے، اگر اس کے تفکر میں مداخلت بیجا کی تو اسے مسحور بھی کر دیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ غالباً سمجھ نہ سکا، اس کی منطق مجبور ہو گئی۔ اس کی اس غیر متوقع حالت پر مجھے سخت تعجب ہوا، میرے دل کی حرکت سریع ہو گئی؛ اور میرے خون کی حرارت اس قدر بڑھ گئی کہ میرا رنگ تمپئی سے گلابی ہو گیا مگر کمند پھینکی جا چکی تھی، جمالی اس میں پھنس چکا تھا اور وہ صرف مرد تھا اور حیوان میری نازلہ، میں پوری طرح محسوس کر رہی ہوں کہ یہ انکشاف تمہارے خیال کو ضرب و صدمہ پہنچا رہے ہوں گے۔ لیکن تمہیں غور کرنے سے روشن ہو جائے گا کہ جب محبت کی وجہ صرف جوانی ہوتی ہے تو اس کا پرواز تعشق یہی ہوتا ہے، پیمانۂ محبت جب سرجوش ہو جاتا ہے، تو اسی طرح چھلکتا ہے، چھلکتا ہے اور ذرا سی جنبش سے چھلک جاتا ہے۔

چشم زدن میں، جمالی کی ہستی میرے ذہنی تسلط میں تھی، اس طرح کہ گویا وہ مٹی کا ایک تودہ تھا، اور میرا دستِ شوق ایک صناع۔ میں نے اپنی سریع دستکاری سے اُسے ایک خوبصورت مجسمہ، ایک دیوتا کی صورت میں تبدیل کر لیا، میرے ایک لمس سے اس کا مُنہ چومنے کے قابل بن گیا، ایک لمس سے اُسکی آنکھیں مشتعل نیم شبی کی طرح روشن ہو گئیں۔ آن واحد میں میرے اندر کی دیوییت نے اسے ایک دیوتا بنا لیا۔ میں معترف ہوں کہ میں خود بھی اس معجزہ سے ششدر و حیران

ہو گئی۔ آخر میں کہاں تھی، مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں اس وقت تک اس شباب درخشاں کو فراموش کیے بیٹھی تھی، اس گلِ تر کو میں نے اپنے دیوتا کے عناصر ترکیبی میں اب دیکھا!
میں دل ہی دل میں اس کے نام کی تکرار کرنے لگی "جمالی، جمالی" اس کا ہر ہر حرف مجھے بیخود مدہوش کیے دیتا تھا، میں نے اُسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔
"ہر وقت رقص میں مشغول!" اس نے کہا۔ "تمہیں تعجب ہوا" میں نے جواب دیا۔ "تم کدھر نکل آئے" بغیر کسی جھجک کے میں اس کے قریب ہو گئی لیکن دفعتہً والد آ گئے اور بولے :-
"نوسیکا ناشتہ طیار ہے"
"میرا جی نہیں چاہتا" میں نے چلا کر کہا "خدا حافظ!"
انھوں نے سر کے اشارے سے اتفاق کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری کیفیات کو بخوبی سمجھ رہے تھے میں نے پھولوں اور پتیوں کا ایک ہار بنا کر اپنے سر سے لپیٹ لیا، پھر اس تاج کو بھی پھینک دیا، اور فرش سبزہ پر گر گئی
بالآخر میں اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی اور مجھے نیند آ گئی۔ جب میں بیدار ہوئی تو میرا چھوٹا سا کمرہ مجھے حجلۂ موسیقی نظر آیا! اور ایک ایسی روشنی سے منور جو ضیائے آفتاب سے زیادہ عجیب تھی۔ میں اس سوچ میں بستر پہ پڑی ہوئی تھی کہ آخر میں اس قدر ناز کیوں اور کس پر کر رہی ہوں؟ میں اٹھی مگر میرے سارے جسم میں سنسناہٹ تھی۔ میں ایک عمر کا کام ختم کر چکی تھی۔ میں محبت کرنے لگی تھی
"جمالی" میں نے پھر دُہرایا، آئینہ کے سامنے گئی اور اپنے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان دیکھ کر متعجب ہوئی میں نے اپنے عکس پر چپکے سے کہا آج میں اپنے تئیں اپنے محبوب کی خاطر سنواروں گی" چنانچہ میں نے اپنے گیسوؤں کو نہایت حسین وضع پر آراستہ کیا اور نہایت عمدہ حسین

لباس سے، جیسے میں ماتھے راں پہنچکر خدا حافظ کہہ دیا کرتی تھی، اپنے تئیں پوری طرح سنوارا۔

کھانے کا وقت ہو گیا تھا، میں آہستہ آہستہ کھانے کے کمرہ میں داخل ہوئی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے والد نے مجھے بغور دیکھا اور حسب معمول مسکرا کے پھر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ جمالی نے مجھے ایک مرتبہ بھی نہ دیکھا۔ وہ نہایت بھدی طرح کیفیات کی دلکشی کو نظرانداز کر رہا تھا اور شاید حقیقت کے عمق کو دریافت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔ لیکن ایک بچہ کی طرح جو ڈانٹ دیا جائے، پھر خاموش ہو گئی۔ کھانا کس سے کھایا جاتا تھا، مجھ پر ایک شدید غمگینی طاری ہو گئی۔ میں یکایک اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور وہاں پہنچ کر خوب روئی، اور نازلہ تمہاری طرح میں نے بھی اُس وقت موت کی خواہش کی۔

تھوڑی دیر بعد میرے حواس درست ہو گئے، اب میں اپنے غم کی شیرینی میں تحلیل ہو رہی تھی؛ میں نے جانا کہ "محبت کرنا اور اُسے گم کر دینا" کیا معنی رکھتا ہے۔ میں کھڑکی میں جا بیٹھی اور بے وفائیوں کے تذکرے میرے ذہن میں تازہ ہو گئے، زندہ ہو گئے۔ اسی خیال میں محو بیٹھی رہی یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ کھانے کی اطلاع ملی اور میں غمزدہ و خاموش کمرے میں داخل ہوئی؛ لیکن میرا یہ اندازِ متالم بھی بے نتیجہ تھا، کیونکہ دونوں آدمیوں میں سے ایک نے بھی میری طرف توجہ نہیں کی؛ اور میں پھر اپنے مجلۂ خیال میں داخل ہو گئی۔ جوانی کا خون میری شرائین کے اندر کف پیدا کر رہا تھا، اور میری مایوسانہ حالتِ دماغی ایک طوفان میں مبتلا تھی۔ ہر چند میں نے سکون حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر کچھ سود مند ثابت نہ ہوئی۔ میری نگاہ کی ضعیف و بے رونق ہنسی بھی بیکار گئی۔ میرے والد جانے کے لئے اُٹھے کیونکہ انہیں کسی نہایت اہم مسئلہ پر غور کرنا تھا۔

وہ چلے گئے اور کمرے میں یکسر خاموشی ہو گئی۔ ہم دونوں خاموش تھے اور تنہا۔ میں اُسے گھور رہی تھی، وہ گردن جھکائے بیٹھا تھا، اور صرف سوچ رہا تھا۔

میرے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ وہ اس لمحہ کی موسیقی و شعریت کو زائل کئے دے رہا تھا، لیکن اس کا شباب اور قوت۔ ان دو لفظوں کے سحر نے میری ساری ہستی کو اپنی جاذبیت کے لئے وقف کر لیا تھا۔ میرے جذبات میں اس وقت سخت طغیانی تھی۔ "اگر وہ میرے ساتھ معاشقہ کی ابتدا نہیں کرتا، تو میں پیش قدمی کروں گی۔" میں نے اپنے آپ سے کہا نازو پیاری، ذرا میری اس وقت کی جرأتوں پر غور کرو! سامنے کے آئینے میں مجھے اس حرکت کا احساس ہوا اور انفعال سے میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بہر نوع میں نے اپنے دیوتا کو اب قفس میں بند کر لیا تھا، جس سے میں اپنا دل بہلا سکتی تھی۔ غریب جمالی کا رنگ فق ہو گیا۔ غالباً تم بھی تسلیم کرو گی کہ اس کے لئے ایسا ہونا ایک امر طبعی تھا۔

"مسٹر جمالی، کچھ شعر و سخن سے شوق ہے؟ میں نے دریافت کیا

"کچھ یوں ہی"

"کس شاعر کا کلام مرغوب ہے؟"

"میں نے کبھی خاص دلچسپی سے کسی کا کلام نہیں پڑھا"

میں ذرا اس کی جانب جُھک گئی۔ اور میری آواز سرگوشی سے کچھ یوں ہی سی بلند تھی اس نے اِدہر اُدہر دیکھا، گویا کہ بھاگنے کی کوشش میں تھا، رومال نکال کر مُنہ پر پھیرا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، میں نے اس سے کہا "انسان محبت کر کے بیوقوف ہو جاتا ہے"

میرے دل میں ایک خاص قسم کی سنسناہٹ پرورش پا رہی تھی، میں غیر معلوم طریقہ پر ایک شعلہ کو ہوا دے رہی تھی۔ شائد اس لئے کہ میرے ہیجان کی آگ پوری طرح بھڑک اُٹھے۔ میرے لبوں پر لرزش کھیلنے لگی، میں اور جُھک گئی اور میری آواز دور سے آنے والی صدائے موسیقی میں تبدیل ہو گئی۔

"کبھی تمہیں بھی کسی کے ساتھ محبت ہوئی ؟"

وہ مجھے توجہ و غور سے دیکھنے لگا اور ایک سحر زدہ کی مانند خاموش ہو کر رہ گیا۔ یقیناً مجھے اس نے کوئی وحشت زدہ ہستی سمجھا؛ ایک کنواری لڑکی کا ایسی تنہائی میں کسی مرد سے نزدیک ہو کر اختلاط آمیز گفتگو کرنا ضرور باعث حیرت ہو سکتا ہے

"مجھے! نہیں میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا، میں ہمیشہ اپنے مطالعہ میں مصروف رہا، تم سمجھ سکتی ہو کہ مطالعہ کس قدر متانت طلب ہے۔"

وہ بھی ایک اندازِ التفات کے ساتھ جھکا اور میرے اندر پھر ایک سنسناہٹ دوڑ گئی

"کیا آپ میری جد و جہد کا حال سننا چاہیں گے ؟"

سننا چاہوں گی! کیسا عجیب سوال تھا ؟" میرا تو سامعہ، باصرہ، روح و دل سب سراپا شوق بنکر اس کی طرف متوجہ تھا! اس نے اپنی اور اپنے خاندان کی تاریخ دہرائی۔ مگر اس داستان مصائب میں ایک موقعہ بھی ایسا نہ تھا، جسے رومان سے تعلق بعید بھی ہو۔ ایک لمحہ ایسا نہ تھا کہ اُس نے اپنے تئیں آزاد چھوڑ دیا ہو۔ میرا دل بیٹھتا ہوا معلوم ہوا؛ اس کا ہر لفظ میری محبت کو مجروح کئے دے رہا تھا۔ جمالی ان لوگوں میں تھا، جن کا مصرف صرف "دیکھے جانا" ہوتا ہے، جو صرف باتیں کئے جانے کے لئے ہوتے ہیں، نہ کہ اُن کی باتیں سننا یا جواب کی آرزو کرنا، جس کا نتیجہ سخت مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

میری شکستگی دل کے لئے یہ بس تھا کہ جس تمنا کی میں نے پرورش کی تھی وہ اسے مجروح کر رہا تھا، خستہ کئے دے رہا تھا، میں اٹھی، وہ بھی اُٹھا ایک لمحہ کے لئے ہم دونوں برابر کھڑے رہے اور میری نگاہِ شوق نے پھر اسے تمام خوبیوں کا پیکر بنا دیا

"مسٹر جمالی، کیا ہم دونوں آپس میں دوست نہیں ہیں؟" یہ کہہ کر میں نے ہاتھ بڑھایا۔

اس نے اسے اپنے ہاتھ میں لیلیا اس کا ہاتھ گرم تھا۔ مجھے دیکھا اور کچھ شرمایا ہوا سا نظر آیا۔

تاژلہ پیاری اس واقعہ کے بعد کا جائزہ دینا ممکن نہیں ہے، خاص خاص باتیں یاد رہ گئی ہیں۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ میری کیفیات و حالات کا تلون جاری رہا، کبھی تو میں غمگین ہوجاتی اور خواہش کرنے لگتی کہ وادیٔ نیل کا کوئی سانپ مجھے بھی غفلت کی نیند سُلادے اور کبھی ہنسنے اور گانے میں سرمست ہوجاتی، کبھی تو مجھے اس کی محبت میں شک ہونے لگتا۔ اور کبھی میں اسکے مفتوح ہوجانے کے خیال سے مغرور ہوجاتی۔

وہ مجھے اپنی تجاویز سناتا اور میں چشمہ کا پانی اُس پر اچھالنے لگتی۔ وہ میری اس حرکت پر خاموش ہوجاتا۔ مجھے گھورتا، میں چاہتی تھی کہ اس طرح جھنجھوڑوں کہ اس کا جمود ایک التہاب سے بدل جائے، وہ مجھ سے شدید و حقیقی معاشقہ کرنے لگے، جس میں اس کے حیات مستقبل کی تجویزوں کو مطلق دخل نہو۔

اس نے فلسفہ پر ایک مضمون لکھا تھا، ایک دن مجھے سُنانے لگا، میں اُٹھ کر چل دی۔ اسے سخت رنج ہوا۔ میں نے اس کی رضا جوئی کی اور دوسرے وقت باقی مضمون سُننے کے وعدہ پر وہ خوش ہوگیا

ایک روز بارش خوب ہورہی تھی، میرے ہیجان میں جوش پیدا ہوا، میں تعطل سے گھبرا گئی اور حرکت کی طلبگار تھی۔ میرے والد مصروف تھے۔ ہرچند میں اُس وقت تو اندھی ہو رہی تھی مگر آج سوچتی ہوں کہ وہ تمام محبت جو مجھے اُن کے ساتھ تھی اُن کے سیکرٹری میں منتقل ہوگئی تھی۔ جالی، دروازہ میں کھڑا ہوا (لفظاً) برسات کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ وہ کچھ ملول سا نظر آیا۔ میں اُس کے پاس گئی اور کہا "چلو سیر کو چلیں"

"اس بارش میں؟" اس نے جواب دیا اور مجھے اس طرح دیکھا گویا میں پاگل ہوگئی ہوں

"کیا تم ڈرتے ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر چلو، طیار ہو جاؤ۔ میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔" میں اپنا بوٹ پہننے اور برساتی لینے چلی گئی۔ میں نے سُنا۔

"مجھے مس نوشابہ کے ہمراہ جانا چاہیئے؟"

"کیوں کیا ہرج ہے؟" میرے والد نے جواب میں کہا، میں اس کے اس سوال کی حماقت پر خوب ہنسی، میرے جسم کا ریشہ ریشہ ہنس رہا تھا۔ غرض ہم دونوں نکل گئے اور خوب بھیگے۔ جنگل اور پہاڑیاں پانی کی چیزیں معلوم ہو رہی تھیں۔ دنغت برگ زار، حسب دستور واقعات حسن وعشق کا اعادہ کر رہا تھا جو ابتدائے آفرینش سے جھاڑیوں اور کنجوں کے اندر رخنہ انداز نگاہوں سے بچ کر، کیوپڈ کے مندر پر اپنے ہدایائے بوسہ پیش کرتے رہے ہیں۔ ایک چٹان کے کنارے پر ہم کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے برابر تھا۔ اس کا تنفس وزنی تھا، میری اچھی نازلہ، میں کیونکر اپنا دل ان صفحات پر نکال کر رکھ دوں؟ تمہیں یہ بتانے کے لئے کہ صرف یہ لمحہ تھا، جسے میں اپنی زندگی سے تعبیر کر سکتی ہوں، میں اپنی ہستی کے تمام تر تخیل کے ساتھ اس کی جانب مائل تھی، اس کی طلبگار تھی، اس سے مل جانا، اس میں مدغم ہو جانا چاہتی تھی، میں چاہ رہی تھی کہ اس کے بازو کشادہ ہو کر بڑھیں اور مجھے حلقہ میں لے لیں اور آپس میں مل جائیں، اس طرح کہ گویا وہ خلا کسی شے سے پُر ہوا ہی نہیں۔ میری سانس رک رک کر چلنے لگی، اس میں حرارت بڑھ گئی مگر وہ دوسری طرف دیکھنے لگا اور وہ لمحہ پرواز کر گیا۔

میرے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی، "چلو" میں نے کہا "گھر واپس چلیں۔"

"ہاں بہتر تو یہی ہو گا" وہ دبی آواز سے بولا "ہم دونوں بالکل شرابور ہو گئے ہیں۔"

تم بھی کہتی ہو گی کہ عجیب قسم کا آدمی تھا! نانزلہ وہ نہ صرف ایک عجیب قسم کا آدمی، بلکہ ایک پارۂ سنگ تھا۔ ہم واپس ہوئے، میری رفتار سے غضبناکی کا اظہار ہو رہا تھا، ایک تنگ راستہ میں پہنچ کر میرے جذبات نے پلٹا کھایا، میں رکی اور اس سے کہنے لگی:۔

"آؤ دیکھیں ہم دونوں میں کون قوی تر ہے۔"

"قوی تر!" وہ یہ سن کر کچھ کھو سا گیا، "کیونکہ؟"

"تم میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچو اور میں اپنی طرف۔" میں نے کہا اور اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر اک غیر محسوس طریقہ سے اس کی طرف کھینچنے لگی۔ اس کی آغوش تک پہنچ گئی۔ میں اُٹھ بیٹھی اور نہایت مسرور، گھر پہنچی۔ سب سے پہلے میں اپنے کمرے میں آئینہ سے دریافت کرنے لگی کہ آیا نوشابہ اور مجھ میں کوئی فرق تھا۔ کیونکہ میں ایک عظیم تغیر کی متوقع تھی۔ میرے بالوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔

اس کے آغوش کی لذت تازہ تھی اور میں نے اس کو ایجاب و قبول کے الفاظ سے تعبیر کیا اور اپنے تئیں جمالی سے منسوب باور کر لیا۔ نازو اس تجربہ کے بعد میں تمہارے اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتی کہ معاشقہ کی ابتدا مرد ہی کی جانب سے ہوتی ہے یا ہونی چاہیئے۔

ہر چند کہ اس افسانہ کا باقی سلسلہ سننے پر تمہیں کسی کڑی کے گم ہونے کا خیال ہو گا، لیکن ایسا ہو تو سمجھ لینا کہ وہ تمہاری رسائی سے باہر ہے۔ اگر انجام محبت کو دل گداز جاں گسل کہنا جائز ہو سکتا ہے، تو مجھے اس سے کوئی بحث نہیں، لیکن یہ میرا عقیدہ ہے کہ محبت کا تنہا انجام یہی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ محبت کی زندگی صرف ایک ہی لمحہ کی ہوتی ہے لیکن وہ طبیعتیں جو حامل محبت ہونے کی صحیح استعداد رکھتی ہیں، اس کو غیر فانی بنا کر ابدی وسعت

دے سکتی ہیں۔ چنانچہ میری زندگی، محبت کا لمحہ ختم ہونے والا تھا۔ اس لئے وہ بہت جلد اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اسکے چند روز بعد ایک دن میری والدہ کو کہیں جانا تھا وہ چلے گئے، کھانے کے وقت ہم دونوں تنہا تھے، میں برابر اسے دیکھتی رہی اور اس حالت میں میرے رخسار رنگ انفعال سے وقتاً فوقتاً رنگین ہوتے رہے۔ میں جمالی کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھی۔ اگرچہ مطلع کثیف تھا، مگر میری دنیائے خیال کا آسمان انجم منور تھا؛ میں دنیا کو حسین تر دیکھ رہی تھی۔ عروج محبت کے لمحہ کو بجا طور پر حیات جاوید سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؛ اس لئے میں اس لمحہ کی لذت اندوزی کے لئے اپنے تمام محسوسات کے ساتھ زندہ تھی۔ میں حیات تعاشر کے خواب دیکھنے لگی اور پھر جمالی کی طرف دیکھ کر ہنس دی۔ وہ بھی متبسم ہوا اور جھجکا، میں بھی جھجکی اور اپنا ہاتھ اس کی گود میں رکھ دیا۔ اس نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"جمالی!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"جو تمہارے دل میں ہے، میرے علم میں ہے، ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں!"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر

"مگر کیا؟"

"ہوں" وہ اور کچھ کہہ ہی نہ سکا اور پھر خاموش ہو گیا۔ لذت و انبساط اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ چکے تھے، اور ردّ عمل ہونا لازمی تھا۔

"میں صبح وطن جاؤنگا" وہ بڑی دقت کے ساتھ کہہ سکا۔

"کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟" میں حیران و پریشان ہو گئی۔ میں نے دریافت کیا۔

"نہیں میں اس کا اظہار اس سے قبل کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن جس غرض سے تم آئے تھے؟"

"وہ پوری ہو چکی ہے"

"لیکن والد کو ایک سیکرٹری کی ضرورت ہے"

"ہاں وہ تو چاہتے ہیں۔ مگر میں ٹھہر نہیں سکتا۔ مجھے کالج سے فلسفہ کی ڈگری لینی ہے۔"

"فلسفہ اور ڈگری کو چولھے میں ڈالو، آہ جمالی، تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"مجھے محبت تو ہے۔"

"تو پھر کیوں جاتے ہو"

"واقعہ یہ ہے کہ میں ٹھہر نہیں سکتا"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا؛ وہ بھی متاثر ہوا۔ اس نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا، اور میرے ہاتھ اس کی گردن کا حلقہ بن گئے۔ میں سمجھی کہ اس مسرت سے میں جان بر نہ ہو سکوں گی۔

"پیارے جمالی، یہیں رہو، مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ!"

"کاش میں ٹھہر سکتا!"

میرے والد آ گئے۔ میں جلدی سے علیحدہ ہو گئی وہ فوراً کمرے سے چلا گیا۔ اور والد آرام کرسی پر بیٹھ گئے

"کیا بات ہے نوسیکا؟"

"ہاں مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے" میں ان کے برابر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہاں!" میں نے سارا حال کہہ دیا

ان کی گردن کو خفیف سی حرکت ہوئی اور بولے:۔

"میرا سیکرٹری حل مسائل میں میرا ساتھ نہیں دے سکا"

اس وقت میں نے جمالی کو اپنے باپ کی نظروں سے دیکھا اور میرے خیال کا طلسم باطل ہونے لگا۔ میں اب اپنے والد سے پھر محبت کرنے لگی تھی، اور جو جگہ میرے دل میں خالی ہو گئی تھی اس کو میں نے پھر اُن کی محبت سے بھر لیا۔

صبح میں نے جمالی کو رخصت ہوتے نہیں دیکھا، کیونکہ میں نے رات کو اس قدر آنسو بہائے تھے، کہ صبح کے وقت اس کے سامنے پیش کرنیکے لئے میرے پاس کوئی موتی نہ رہ گیا تھا۔

"نوسیکا اب کیا حال ہے؟" چند دن کے بعد میرے والد نے پوچھا۔

"حال کیا ہے۔ میں محبت کی زندگی ختم کر چکی ہوں اب مجھے کبھی محبت نہ ہو گی۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں رہی"

وہ ہنسے اور مجھے پیار کیا

اچھی نازلہ یہ تھا میری حیات معاشقہ کا افسانہ، میرا رومان محبت، اس کو پڑھ کر اپنے دل کو تسکین دو جلدی نہیں، مگر کچھ عرصہ کے بعد مجھے اپنی محسوسات و کیفیات سے اطلاع دیناکہ تم میرے دل یعنی اک ارباب شکستہ کی صدا سے کس درجہ ہم آہنگ ہو؟ خدا حافظ، پیاری نازو

تمہاری ہمیشہ

نوشابہ

لطیف احمد

عشق کی دُلھن

کسی زمانے کا ذکر ہے کہ عشق کا دل باوجود اپنی بیشمار فتوحات کے بہت اُداس ہو گیا۔ اُس نے جی میں کہا۔ کہ میں آجتک اوروں کے لئے دلوں کو فتح کرتا رہا۔ لیکن افسوس کہ میں نے اپنے لئے کوئی ہستی تلاش نہ کی۔ اب تو کچھ بھی ہو۔ میں کسی ایسی حسین وجمیل دوشیزہ کو اپنی دُلھن بنا کے رہونگا جو اس ویران دنیا کے گوشۂ تنہائی میں میری رفیق وہمدم بنے۔

یہ سوچ کر وہ بیوی کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے بہت سی تجویزیں سوچیں۔ ان پر بھی عمل کیا۔ مگر بے سود۔ آخر ایک تدبیر اُس کی ذہن میں آئی۔ اُس نے سونے اور جواہرات کی ایک بہت بڑی بھاری ترازو بنائی اور سونے ہی کی ایک خوبصورت زنجیر کے ساتھ آسمان کے نیچے لٹکا دی۔ اس ترازو میں یہ خوبی تھی کہ گو وہ کافی بوجھ کی متحمل ہو سکتی تھی تاہم اس قدر باریک اور نازک تھی کہ انسان کی آنکھیں اس کے دیکھنے سے عاجز تھیں؛

ایک دن صبح کے سہانے وقت جب سورج چمک رہا تھا۔ پرند چہچہا رہے تھے اور پھولوں سے بھینی بھینی مہک نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اس نے اپنے تمام دوستوں اور رفیقوں کو اس جگہ بُلایا جہاں ترازو لٹک رہی تھی اور سورج کی ہنستی ہوئی کرنوں سے مُسکرا مسکرا کر چشمک زنی کر رہی تھی۔

عشق نے اپنے دوستوں پر اپنا مقصد ظاہر کیا۔ اور کہا، صاحبو۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ دلھن کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کا وزن میرے وزن کے برابر ہو۔ یہ کہ کر وہ خود ترازو کے ایک پلڑے میں بیٹھ گیا۔ اُسکے دوست اور رفیق بہت پیاری پیاری لڑکیاں اور خوبصورت لڑکے قوس قزح کے رنگوں کے لباس پہنے ارد گرد جمع تھے ان سب نے لپک کر

دوسرا پلڑا اتھام لیا۔ اور اسے جھکا کر زمین کے ساتھ لگا دیا ؛

عشق پلڑے میں بیٹھا ہوا ایسا حسین و رعنا نوجوان نظر آ رہا تھا کہ کوئی لڑکی اسے ناپسند کرنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ آسمانی لڑکیاں اس کے گرد ہنستی مسکراتی پھر رہی تھیں اور کبھی کبھی اشتیاق کی نظروں سے عشق کو گھورتی بھی جاتی تھیں ؛

دفعتہً لوگ ایک نہایت خوبصورت لڑکی کو سامنے لائے جس کا قد بہت موزوں، جسم بے حد نازک۔ رخسار گلاب کے پھول۔ آنکھیں بہت رسیلی اور چمکدار اور دہن غنچہ ناشگفتہ سے دلآویز تھا وہ دوسرے پلڑے میں بٹھا دی گئی۔ ہر طرف سے تالیوں کا شور اٹھا۔ عشق نے اس لڑکی کو دیکھا۔ دل ہی دل میں خوش ہوا۔ لیکن اس لڑکی کا پلڑا اوپر کی طرف اٹھ گیا کیونکہ وہ عشق کی نسبت بہت ہلکی تھی ؛

ایک طرف سے آواز آئی "ملکۂ حسن" عشق کی دلھن نہیں بن سکتی۔

اس کے بعد لوگ ایک زندہ دل لڑکی کو سامنے لائے جو ہر شخص سے باتیں ملاتی اور ہر جگہ خوش خوش پھر رہی تھی وہ ملکۂ حسن کے برابر حسین تو نہ تھی لیکن اس کے خط و خال پسندیدہ اور موزوں تھے۔ وہ خاموش اور نچلی نہ بیٹھ سکتی تھی اس لئے جب وہ پلڑے میں بیٹھی تو کبھی پلڑا اوپر ہوتا تھا کبھی نیچے۔ غرض کہ اس کی طبیعت کی طرح پلڑے کو بھی قرار نہ تھا۔ آخر وہ بھی اتار دی گئی۔ اور کسی نے کہا :۔

خوش طبعی سے عشق کو کیا تعلق ؟ !

دفعتہً پاس ہی سے ایک فرحت انگیز قہقہے کی آواز سنائی دی ایک لڑکی ہنستی ہوئی دلیرانہ آگے بڑھی اور کہنے لگی کہ ذرا مجھے بھی پلڑے میں بیٹھنے دو۔ یہ لڑکی چھوٹی سی اور حسین تھی۔ اسکی آنکھوں میں ایک ساحرانہ کشش اور چمک تھی اور اسکی خوبصورت پوشاک کے دامن ہوا سے ادھر ادھر لہرا رہے تھے وہ دوڑ کر پلڑے میں بیٹھ گئی لیکن وہ ہلکی پھلکی لڑکی عشق کے برابر کہاں ہو سکتی تھی۔ پلڑا اوپر کو اٹھا اور وہ زمین پر آ رہی۔

سب ہنس پڑے اور کہنے لگے ”مسرت بھی عشق کے مقابلے میں ہلکی نکلی۔

خود آرائی آگے بڑھنے کو تھی کہ لڑکیوں کے صف کے آخری حصے میں سے ایک بلند قامت خاموش اور متین عورت چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ عشق کانپ اُٹھا اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور کہا ”آہ! یہ تو حسرت ہے۔ خدایا یہ میری دُلھن نہ بنے“ حسرت پلڑے میں بیٹھی مگر وہ عشق سے کچھ زیادہ وزنی نکلی اس لئے منتخب نہ ہوسکی۔

اس کے بعد ملکہ خود آرائی چاروں طرف دادطلبی و تحسین خواہی کی نگاہیں ڈالتی ہوئی اگرچہ اپنی مرضی ہی سے آگے بڑھی۔ مگر کچھ اس شان سے آئی گویا کسی پر احسان کر رہی ہے۔ وہ پلڑے میں بیٹھی تو اس قدر ہلکی نکلی کہ عشق کا پلڑا ادھر سے زمین پر آپڑا۔

ساری محفل مارے ہنسی کے لوٹ گئی۔ خود آرائی کا چہرہ شرم آمیز غصے سے تمتما اٹھا اور وہ سر جھکائے حلقے سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد بہت سی لڑکیاں تُلیں۔ خودداری نہایت سنجیدگی اور وقار سے آئی۔ تمنا اوج تخئیل کی وجہ سے آسمان پر نگاہیں جمائے آگے بڑھی۔ دانش اپنے بےنظیر حُسن اور لاجواب شان تمکین سے پلڑے میں بیٹھی مگر عشق کی ہموزن نہ نکلی۔

عشق نے آہ سرد بھر کر کہا کہ ”یہ سب معزز خاتونیں میری بھی خواہ و غمخوار ہوسکتی ہیں۔ لیکن میری رفیق زندگی کہاں ہے؟

کوئی پانچ منٹ تک محفل میں سناٹا رہا اسکے بعد ایک سن رسیدہ خاتون جسکے بُشرے سے محبت اور شفقت کی کرنیں چمک رہی تھیں ایک نوخیز دوشیزہ کو ساتھ لئے حلقے میں داخل ہوئی۔ اُس دوشیزہ کا چہرہ نقاب میں اچھی طرح چھپا ہوا تھا معمر خاتون نے حاضرین مجلس سے کہا کہ ”لو میری بیٹی کو تولو۔ اگر یہ بھی عشق کی دلھن نہ ہوسکی تو پھر چاروں کھونٹ میں عشق کو موزوں بیوی ہرگز نہیں مل سکتی“۔

شرمیلی لڑکی چہرے پر نقاب ڈالے پلڑے میں بیٹھ گئی ترازو کچھ دیر تو ڈگمگاتی رہی لیکن آخر جب ساکن ہوئی تو دونو پلڑوں کا وزن بالکل برابر اُترا

تمام مجلس تالیوں کے شور سے گونج اُٹھی اور بہت سی کام لڑکیاں نقاب پوش دوشیزہ کو حسد کی نظروں سے دیکھنے لگیں ؛

عشق اُمید و بیم کے جذبات سے کانپ اُٹھا اُس نے گھبرا کر کہا "ذرا مجھے دُلھن کی صورت تو دکھاؤ" معمر عورت نے بڑھ کر اپنی بیٹی کا ہاتھ تھاما اور اس کے چہرے سے نقاب الٹ دی وہ سرو قد اور حسین لڑکی نہایت وقار کے ساتھ نظریں جھکائے کھڑی تھی اور اس کی لمبی لمبی گھنی پلکیں اُس کے رخسار رعنا کی بلائیں لے رہی تھیں۔ عشق دلھن کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے کچھ مایوس سا ہو گیا۔ لیکن جب دُلھن نے اپنی نظریں اٹھا کر۔ ایک شرمگین۔ محبت آمیز اور خلوص سے بھری ہوئی نگاہ دولھا کے چہرے پر ڈالی تو عشق نہال ہو گیا اُس نے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا اور کہا "میری پیاری مجھے تم سے بے حد محبت ہے" !

یہ کہ کر دونو بڑھے اور دونو نے جھک کر تمام اہل مجلس کو سلام کیا ؛

عشق نے اعلان کر دیا کہ نیک سیرتی کی بیٹی وفا عشق کی دُلھن ہے۔ اس لئے آیندہ جو شیوہ عشق اختیار کرے اُسکے لئے لازم ہے کہ باوفا بھی ہو !

"عبدالمجید سالک"

نابینا نوجوان

وہ پیدائشی اندھا تھا۔ اس کی بے بصارت آنکھیں ایک آئینہ تھیں۔ جن میں اس دلفریب دنیا کی حسرت دیدار بیٹھی جھانک رہی تھی۔ یا وہ نقاب تھیں جس کے پیچھے آرزوئے شاعر کی طرح ایک عجیب تمنا بے چین تھی۔ جس لحظہ سے اس کو آغوش مادر کی خمار انگیز حرارت کا احساس ہوا اس نے ہمیشہ اپنی تنہا اور سنسان ہستی کو ایک تیرہ و تاریک عالم میں گم گشتہ پایا۔ اس کی بے بصارتی کوئی موروثی عیب نہ تھی۔ کہ اس کے باعث اسے مہد سے لحد تک یعنی اپنی پہاڑ سی زندگی کا تمام عرصہ ناقابل نفوذ تاریکی اور بے شعاع تنہائی میں صرف کرنا پڑتا۔ اس کی ماں ایک شریف و معزز خاندان کی اولاد سے تھی۔ وہ حسین تھی۔ سیاہ اور بڑی بڑی آنکھوں والی تھی۔ اس کی سُرخ و سفید رنگت تھی۔ اور جسم کنول کی شاخ، اس کا باپ خاندانی رئیس تھا۔ اور اس کے تمام خاندان کا کوئی فرد بھی نابینائی جیسی نحس مصیبت سے داغ آلودہ نہ ہوا تھا۔ چنانچہ بدقسمت بچے کی اس ملال انگیز کمی کا باعث قضا و قدر کے وہی پر اسرار کھیل سمجھے گئے جو کبھی کبھی پردۂ غیب میں سے مسکراتے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں۔

سہانی دھوپ اس کے لئے گرمی کی ایک خوشگوار کیفیت سے زیادہ نہ تھی۔ پھول اس کے لئے شیریں خوشبوئیں تھیں۔ اور اس کے عزیز اور دوست چند مشفقانہ آوازیں، ایسی ہستیاں جن کے قرب سے ہمدردی کی حرارت کا احساس ہوتا تھا۔ جن کے ہاتھوں کے مس میں سکون و اطمینان کا سحر تھا۔ اور جن کی آنکھوں سے کبھی کبھی اس کے رخساروں پر گرم گرم آنسو بھی ٹپک پڑا کرتے تھے اس کی غیر مرئی دنیا تکلیف دہ نشیب و فراز اور بہت سی ایسی سد راہ چیزوں سے پر تھی۔ جن سے اکثر اس کا جسم ٹکراتا اور زخمی ہوتا رہتا تھا ایسے خطرات اور شور و غل سے لبریز تھی۔ جن سے یکایک

اس کے تاریک سکوت میں ایک ہلچل مچ جاتی تھی۔ وہ جگہ تھی جس میں اکثر ایسی ناہموار سطحیں تھیں
کہ جب وہ اپنی ذی حس انگلیوں کے سروں سے انہیں چھوتا تھا۔ تو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے
ہو جاتے تھے۔ دھوپ اور چھاؤں دن اور رات، رنگ اور شکل۔ کیف و کم حسن و قبح یہ تمام
ایسے الفاظ تھے جن کے معنے کا وہ کوئی سراغ نہ لگا سکتا تھا۔

گو یہ نابینا شخص متمول بھی تھا۔ لیکن وہ اپنے تمول پر اس قدر فخر و ناز کرتا تھا۔ جس قدر اس
سرمایۂ عشق و محبت پر جو اس کی ماں کے ذہن آرزو میں صرف اسی پر نچھاور کرنے کو جمع تھا۔
یہ نابینا شخص اپنی ماں اور بہن کے ہمراہ رہتا تھا۔ مایوسی اور دلشکنی اس کے باپ کا کام تمام کر چکی
تھی۔ کیونکہ اس کے دل میں اپنی اولاد کے متعلق بڑی بڑی امنگیں او[illegible] پھر اکلوتے
بیٹے کا نابینا پیدا ہونا اس کے واسطے ایک ایسا برق صفت امید سوز انکشاف تھا۔ جس نے
اس کی کمر توڑ دی اور آخر اس کی جان لے کر رہا۔ یہ بچہ خوبصورت تھا۔ اس کی رنگت سفید
تھی نقش و نگار نازک تھے، وہ تندرست و توانا تھا۔ خوش مزاج تھا۔ حلیم الطبع تھا۔ اور جو کوئی
اس سے ملتا۔ اس کی بیچارگی اور بے بصارتی پر وہ گرم آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکتا تھا، موسیقی
اس کی زندگی کا جوہر تھی۔ وہ گانا سنتا۔ موسیقی کے دریائے بے پایاں کی لہریں اس کو اپنے
سینے پر اُٹھا کر عالم خیال کے ان جزیروں میں پہنچا دیتی تھیں، جہاں زمین کا سر سبز اور پھولوں
کے معطر دامن عالم علوی کا راہ بتاتا ہے۔ جہاں تاریکی روشنی ہے۔ اور روشنی تاریکی۔ پھولوں کے
نازک لبوں میں بلبل کا سوز ہے۔ اور بلبل کے پردوں میں پھولوں کی خوشبو۔ جنگل سبزہ زار ہیں۔ اور
سبزہ زار گنجان اور کثیر درخت ایک عالم بے خودی ہے۔ ایک دنیائے خود فراموشی۔

ادب لطیف سے وہ خوش ہوتا تھا۔ شاعری اس کی روشنی تھی کیوپڈ کی طفلانہ شوخیاں
وہ نہ سمجھ سکتا تھا آنکھوں کے وار اسے معلوم نہ تھا۔ کتنے کاری ہوتے ہیں۔ وہ کہتا تھا آواز عشق

کا پہلا تیر ہوتی ہے آواز کے سننے سے دل ساکت ہوتا ہے۔ آواز دل کو تیزی سے دھڑکاتی ہے۔ کسی کی آواز ہی بدن کے رونگٹے کھڑے کر سکتی ہے۔

با مذاق صحبت۔ سیف زبان حاضر جوابی۔ غم انجام اور مسرت انجام افسانے سب میں اسے بے انتہا لطف آتا تھا۔ اور سوائے ان اوقات کے وہ اپنی مصیبت کی دردناک تکلیف اور اپنے مرض کی مجنونانہ نوعیت محسوس نہ کرتا تھا کہ جب وہ بیقرار ہو کر ماں سے چمٹتا اور چاہتا کہ اپنے سینے کے عمیق ترین حصوں میں بیٹھی ہوئی محبت عالم کو آشکارا کرنے کا کوئی ذریعہ پالے:

اس نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ شہر سے دور ایک گاؤں میں بسر کیا تھا۔ وہ جنگل کی تازہ ہوا۔ ندی کی روانی کے مدھم شور اور پرندوں کے چہچہوں سے بہت حظ حاصل کرتا تھا۔ شہروں کی آبادی میں جانے سے اس کو ڈر لگتا۔ شہر کے تنگ و تاریک مکانوں میں ٹھیرنے سے اس کا دم گھٹتا۔ بازاروں کی سامعہ خراش آوازیں اس کی نازک سماعت کے لئے سخت عذاب تھی اور متعفن کریہ بدبوئیں اس کے مشام کو سخت تکلیف پہنچاتی تھیں:

اسی طرح اس کی خاموش زندگی کے چوبیس سال گذر گئے اور اس نے یہ امید بالکل ترک کردی۔ کہ کبھی وہ زمین و آسمان اور سمندر کے عجائبات اور اپنے عالم خیال کی غیر متشکل ہستیوں کے زندہ وجود دیکھ سکے گا۔ بڑے بڑے معالج جو ہر قسم کی نابینائی کے علاج کے لئے شہرۂ آفاق تھے اس کے مرض کی ماہیت معلوم کرنے آئے۔ مگر وہ سب یہ کہہ کر متاسف واپس گئے۔ کہ اس کا علاج انسانی ہنرمندی کی رسائی سے خارج ہے:

وہ محض اپنے عزیزوں کی خاطر زبان شکوہ دراز کئے بغیر معالجوں کے تکلیف دہ سوالات اور صبر آزما مشاہدات کو برداشت کر لیتا تھا۔ لیکن بہت جلد اس نے اپنی اس خوشگوار ایک پرستان کے خواب کی سی دلفریب امید کو ترک کردیا۔ چونکہ اسے علم تھا کہ موہوم امیدوں اور عظیم توقعات

کا انجام پاس ہے اور رضا بقضا میں کم از کم اطمینان قلب تو ہے

(۲)

لیکن اس کی عمر کا پچیسواں سال تھا۔ کہ یہ خبر متواتر اس کے کان میں پہنچی۔ کہ بنگال کے ایک مشہور ڈاکٹر نے بہت سے مادر زاد اندھوں کو بینائی بخشی ہے۔ اور ہر طرح علاج کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی ماں نے اپنے عزیزوں میں سے ایک شخص کو جو خود بھی امراض چشم کا معالج تھا۔ بنگال روانہ کیا۔ کہ وہاں جا کر بشرط امکان ان خبروں کی تصدیق و تکذیب کی صورت نکالے ۔

اس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ "سین بابو" کچھ بہت عمدہ ڈاکٹر تو معلوم نہیں ہوتا۔ ہندوستان ہی کا تعلیم یافتہ ہے۔ لیکن اس کے رقیب معالج چشم اسے جیسا فریبی مشہور کر رہے ہیں وہ ویسا بھی نہیں ہیں نے خود اپنی آنکھوں سے ــــــ اس نے جن نابیناؤں کو بینائی حاصل کرتے دیکھا تھا ان کے قصے بیان کیے۔ اور کہا۔ کہ وہ شوکت کا علاج کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن ناکامی سے بچنے کے لئے پہلے وہ ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہے ۔

ماں نے بے صبری سے پوچھا "وہ کیا؟"

اس نے جواب دیا کہ "اگر شوکت مادر زاد اندھے ہیں تو ان کو بینائی حاصل کرنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔"

یہ سن کر گھر کی مستورات کے مشتاق چہرے افسردہ اور جوش مردہ ہو گئے۔ ماں نے وفور غم سے دبی ہوئی آواز میں کہا "شوکت اندھا ہی پیدا ہوا تھا۔"

اس نے کہا گو سین بابو نے شوکت کو نہیں دیکھا۔ مگر پھر بھی اس نے کہا۔ کہ شوکت مادر زاد اندھا نہ ہوگا دنیا میں شاذ و نادر ہی بلکہ کبھی بھی یہ نہیں ہوتا۔ کہ کوئی مادر زاد اندھا پیدا ہو۔ البتہ اکثر ہوتا ہے۔ کہ پیدائش کے چند روز یا چند گھنٹوں یا چند لمحوں کے بعد بینائی جاتی رہتی ہے۔"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ ماں کا مایوس اور مرجھایا ہوا چہرہ صبح سویرے کے آفتاب کی طرح چمک

اُٹھا اور وہ بے قراری سے بولی "تب تو مجھے یقین ہے کہ شوکت اندھا پیدا نہ ہوا تھا۔ میں اس کے چہرے کو متواتر دیکھتی رہی تھی۔ لیکن کامل دو روز کے عرصے تک مجھے شبہ بھی نہ ہوا کہ بچہ اندھا ہوگا"
اس نے کہا "سین بابو ہر وقت آنے کے لئے تیار ہیں۔ اور وہ صرف آپ کے ارشاد کا منتظر ہے، اور گو ایک ایسے بڑے ڈاکٹر میں یہ بات تعجب انگیز ضرور ہے۔ مگر میں بتلائے دیتا ہوں۔ کہ وہ بہت زیادہ انعام و اکرام کا متوقع ہے۔"

ماں نے بے پرواہی سے کہا "دولت تو کیا۔ وہ میرے شوکت کو تندرست کر دے تو میں ساری عمر کے لئے اس کی غلامی کرنے کو تیار ہوں۔ تم فوراً اسے آنے کے لئے تار دے دو۔ بالفرض اگر کچھ نفع نہ ہوا تو کوئی نقصان بھی تو نہ پہنچیگا"

بلاوے کا تار دے دیا گیا۔ اور ماں بیٹیاں دونوں شوکت کو نئے معالج کی آمد کے متعلق مژدہ سنانے اور ڈاکٹری معائنے کے لئے تیار کرنے گئیں۔
شوکت نے ایک غمگین ہنسی ہنس کر کہا "میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کو حاضر ہوں"
اور ایک ہفتے کے بعد جب سین بابو آگیا۔ تو اُس نے نہایت استقلال سے اپنے آپ کو اس مسیحا کے سپرد کر دیا۔

۳

تمام عزیز اور دوست جمع تھے۔ اور سین بابو شوکت کی آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ہر ایک کی آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر امید کی متلاشی اور کان اس کے لبوں پر لگ رہے تھے۔ زنان خانے میں مستورات کی بے چینی و بے قراری کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ منٹ منٹ کے بعد گھر کے ملازم لڑکے کو بھیجا جاتا تھا۔ کہ پوچھے ڈاکٹر صاحب نے کیا رائے دی۔ اور جب لڑکا خاموش واپس آتا۔ تو ماں بیٹیوں کی تمام روح ایک امید افزا خبر سننے کی توقع میں ان کے کانوں میں جمع ہو جاتی تھی۔ لیکن لڑکا جواب دیتا کہ ابھی معائنہ ہو رہا ہے۔

سین بالپ نے کچھ دیر تک ابتدائی معائنہ کیا۔ اور آخر اس کے لبوں سے وہ لفظ نکلے۔ جنھوں نے سب کے سینوں میں خوشی کے ایسے جذبے پیدا کر دئیے۔ جن میں ہر ایک کا دل ڈوبا جاتا تھا۔ اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ ابھی بصارت کا بحال ہونا ممکن ہے" اس کے بعد وہ اپنی ایک علمی بحث میں مشغول ہو گیا۔ جس کے دوران میں اس نے۔ خلیہ قرنیا۔ ثقبے۔ عصب بصارت۔ عدسیہ۔ رطوبت زجاجیہ اور اس قسم کے بے شمار الفاظ استعمال کئے۔ جن کے سننے سے گرب کی طبیعت گھبرا اٹھی۔ مگر اس پر جامع ہونے کی مہر لگ گئی۔

وہ نہ تو شیخی مارتا تھا۔ اور نہ کوئی پیشین گوئی ہی کرتا تھا۔ کامیابی پر اسے بہت زیادہ اعتماد نہ تھا۔ اور آخر مزید توجہ اور غور کے معائنے کے بعد اس نے شوکت سے کہا :۔

مجھے معاف فرمائیے گا۔ مگر میں یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ آپ اپنے مرض کے متعلق اپنے موافق یا مخالف دونوں طرح کا فیصلہ سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟"

شوکت نے جواب دیا "میں اپنے مرض کے متعلق بہت سی مایوسیاں برداشت کر چکا ہوں۔ اور اب ان کا عادی ہو گیا ہوں"۔

ڈاکٹر نے کہا "تو میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ اگرچہ مجھے اس امر کا یقین ہے کہ میں آپ کی بصارت بحال کر سکتا ہوں" . . . . وہ رک گیا۔

شوکت نے اسے باقی فقرے کہنے کی بھی جرات دلائی "ہاں ہاں مگر . . . .

ڈاکٹر نے کسی قدر پس و پیش کے بعد کہا۔ میں آپ سے اصل معاملہ چھپانا پسند نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا بہت امکان ہے کہ آپ کی صحت محض عارضی ہو۔ آپ کو علم ہے . . .

وہ پھر نئے سرے سے ایک معائنے میں مصروف ہو گیا اور فراغت پانے کے بعد ایک لمبا سانس لے کر بولا "مجھے تقریباً اس امر کا یقین ہے کہ آپ بصارت حاصل کر لیں گے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ محض ایک ذرا سی دیر کے لئے آپ کی بصارت درست ہو۔ کیا آپ یہ بھی برداشت

کر سکتے ہیں ؟"

شوکت نے کچھ تامل اور پس و پیش کے بعد کہا "یہ نہایت مشکل ہے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ میں اسے بھی برداشت کرلوں گا۔"

ڈاکٹر مسٹر نے سمجھا کر کہا "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے آپ سمجھ گئے ہیں۔ آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ عارضی طور پر بصارت بحال ہونے کے کیا معنے ہیں۔ اس حالت میں آپ اپنی بدنصیبی کے پورے معنے سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ نے ابھی تک اپنی قوت بینائی استعمال نہیں کی آپ نے اس دنیا کے عجائبات اور دلفریبیوں کو نہیں دیکھا۔ لیکن اگر بصارت حاصل کرنے کے ذرا سے عرصے کے بعد آپ پھر نابینا ہو جائیں۔ اور ایسے نابینا کہ پھر تمام عمر بینائی حاصل کرنے کی امید نہ رہے . . . " اور اس کی گفتگو ایک پر معنی خاموشی پر ختم ہوگئی ؛

شوکت نے کچھ اندرونی کشمکش کے بعد کہا "جب تک کامیابی کا معقول امکان ہے۔ میں ہر خطرے میں پڑنے کو تیار ہوں"

سین بابو نے یقین دلایا۔ کہ اگر میری ہر بات بلا عذر مانیں گے۔ اور مجھ پر یقین و اعتماد رکھیں گے تو کامیابی کا بہت کافی امکان ہے ؛

(۴)

غرض اس طرح معاملات کا تصفیہ ہوا۔ بنگالی ڈاکٹر گھر کے چند مقررہ کمروں میں فروکش ہوگیا۔ اور اس نے شوکت کا علاج شروع کردیا۔ طریق علاج پیچیدہ اور تکلیف دہ تھا۔ اور نتائج نہایت صبر آزما طریق پر سست تھے۔ چھ ہفتے کے عرصے کے لئے شوکت کو ایک اندھیرے کمرے میں چت لٹایا گیا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر پلستر لگایا۔ اور اس کی بھوؤں پہ سرد پٹی کی کئی تہیں باندھی گئیں + اسے نہایت اندازے سے غذا دی جاتی تھی اور حرکت کرنے کی قطعی

ممانعت تھی۔ لیکن اس نے علاج کے اس طولانی عرصے کو روزافزوں ضعف کو۔ خاموش اور سنسان دنوں کو جن کے بعد بے خوابی کی طویل راتیں آتی تھیں۔ نہایت ہمت اور صبر و خاموشی سے برداشت کیا۔ اس نے ایک بار بھی شکایت نہ کی۔ تکلیف و درد سے کبھی ڈاکٹر کا ہاتھ نہ پکڑا۔ کہ انتظار کا یہ طولانی زمانہ آخر کب تمام ہوگا۔ اس کا درخشاں و تاباں جوہر روح کبھی اس شان اور چمک دمک سے نظارہ افروز نہ ہوا تھا۔

چھٹے ہفتے کا آخری دن تھا۔ کہ سین بابو کی فوری رخصت کے باعث گھر کے انتظار آمیز سکوت میں فکر و تردد کی ہلچل مچ گئی۔

حسب معمول جب صبح کو لڑکا اس کے کمرے میں چائے لیکر گیا تو کمرہ خالی پایا۔ وہاں ڈاکٹر کا اسباب وغیرہ کچھ نہ تھا۔ البتہ ایک خط میز پر رکھا تھا۔ جسے کر وہ دوڑا ہوا پریشان نیچے آیا۔ ماں بیٹیاں دونوں قالین پر بیٹھی چاء پی رہی تھیں۔ کہ اس نے یہ تباہ کن خبر سنائی۔ کہ ڈاکٹر چلا گیا ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسری کو دیکھا۔ یہ غیر متوقع خبر ان کے دل پر تیر کی طرح لگی۔ اور بجلی کی طرح گری۔ دل دُکھ کر رہ گیا۔ اور چہرہ سے خون کی سرخی یک لخت مرجھا گئی۔ وہ ایسی متحیر مبہوت رہ گئیں کہ کئی منٹ تک ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

"کیا ان کی تمنا بھرے خوابوں کی یہی دلکش تعبیر تھی!" لڑکے نے کہا "یہ خط میز پر رکھا ہوا تھا" اور اس نے جھک کر وہ خط ماں کے قریب فرش پر رکھ دیا۔ مصیبت زدہ ماں کی نگاہوں کے سامنے ایک تاریک دھند چھا رہی تھی دنیا ہنڈولے کی طرح اچھلتی اور چکر لگاتی معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اس نے ہمت کر کے خط کو اٹھا لیا۔ اور کھولا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے آنسو ابل آئے۔ خط بہت جلدی میں لکھا گیا تھا۔ بڑھیا کی نگاہ آنسوؤں کے نقاب میں پوشیدہ تھی۔ وہ اسے پڑھ نہ سکی۔ اور خاموشی سے اس کو اپنی بیٹی کی طرف بڑھا دیا۔

بیٹی کی حالت ماں سے کم مصیبت زدہ نہ تھی اس نے خاموشی سے خط لے لیا۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں اسے پڑھنا شروع کیا:

ڈاکٹر کا رخصتی خط نہایت شگفتہ معذرتوں سے شروع ہوتا تھا اور اس کے بعد اس نے لکھا تھا۔ کہ گو مریض کو اس حالت میں چھوڑ دینا ایک ذلیل حرکت ہے۔ مگر میری آیندہ زندگی کی بہتری کا اقتضا یہی ہے۔ کہ میں اب یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ اور ہر وہ شخص جس کے دل میں اپنے مادی فوائد کا کچھ بھی خیال ہو۔ کبھی ایسے زریں موقع کو ہاتھ سے نہیں کھو سکتا۔ پنجاب کے ایک کروڑپتی نے بہت کچھ انعام و اکرام کے وعدے پر مجھے اپنے شہر میں طلب کیا ہے۔ کہ میں اس کے بیٹے کا علاج کروں، جو نہایت سرعت سے اندھا ہوا جا رہا ہے۔ میرا وہاں فوراً پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اس کی بینائی بحال کی جا سکتی ہے تو اس کا یہی موقع ہے: اس کے بعد سین بابو نے تفصیل سے شوکت کے مرض کی بابت لکھا تھا۔ کہ اب اس کے متعلق میرے کرنے کا کوئی کام نہیں۔ جو کام باقی ہے۔ وہ شوکت خود اچھی طرح کر سکتا ہے۔ آخری پلستر کے سوکھ جھڑتے ہی پٹیاں کھول دینی چاہئیں۔ اگر شوکت کی قسمت میں ہے۔ کہ وہ بصارت حاصل کرلے تو اسی مبارک لمحے پر اسے یہ قوت حاصل ہو جائے گی۔ اس کے بعد چند ضروری ہدایتیں تھیں اور آخر میں اس نے اپنے اسی پرانے شک کو دہرایا تھا کہ بہت ممکن ہے صحت محض عارضی ہو:

خط پڑھنے سے دونوں عورتوں کے دل کچھ بڑھ گئے۔ امید کے ٹمٹماتے چراغ کا جل اٹھنا ابھی ممکن تھا ابھی شوکت کی بصارت حاصل کرلینے کا امکان تھا۔ وہ دونوں بدنصیب کے کمرے میں گئیں۔ کہ ڈاکٹر کی رخصت کی خبر کو حتی الامکان خوشگوار بنا کر اسے سنائیں:

وہ بے حس و حرکت پڑا سنتا رہا۔ سننے کے بعد اس کی کمزور اور مرض سے تنگ آئی ہوئی طبیعت صحت کے خیال سے بیزار ہو گئی۔ اور اس نے آہستہ سے رنج و غم میں دبی ہوئی آواز میں کہا "میرا خیال ہے وہ دغا باز تھا۔۔۔۔ میری زندگی اچھی خاصی گزرتی ہے۔ لیکن صرف یہ آپ کی بے سود کوششیں ہیں جو

مجھے بار بار میری بدقسمتی کا احساس دلاتی ہیں"؛

یہ آخری دن بہت صبر آزما تھے۔ امید کا چراغ جو اس پرخطر اور کٹھن راستے میں راہ نما تھا۔ بار بار نگاہ سے اوجھل ہو جاتا تھا پلستر کی جلن اب سخت روح فرسا تھی۔ اس کے سوکھنے کا انتظار بیحد بے چینی سے بھرا ہوا تھا اور کچھ یقین نہ تھا کہ پھر کیا ہوگا! شب تیرہ و تار تھی۔ اور یہ سراپا انتظار۔ تین قابل رحم ہستیاں۔ کوئی رہنما نہ تھا کوئی روشنی نہ تھی۔ معلوم نہ تھا صبح کو سورج انہیں منزل مقصود پر پہنچنے کی مبارکباد دے گا۔ یا منزل مقصود سے کوسوں دور پڑا ہوا دیکھے گا ؛

(۵)

آخر کار وہ لمحہ بھی آپہنچا۔ جس پر نابینا شوکت کی قسمت کا فیصلہ منحصر تھا۔ ماں اور بہن اپنے وفور شوق سے کانپتے جسم اور دھڑکتے دل کو جس کی آواز اُن کے کان تک آرہی تھی بمشکل سنبھال کر اس کے قریب کھڑی تھیں۔ اور وہ پٹی کھولنے کو تھا۔ اس آخری فیصلہ کن لمحے پر وہ کچھ ہچکچا سا رہا تھا۔ نہ معلوم مستقبل کی نسبت ایک بزدلانہ خوف اس کے تخیل و تصور کو مرتعش کر رہا تھا اور وہ اپنا ہاتھ پیشانی تک نہ اٹھا سکتا تھا۔ میں اس روشن دنیا کے طلسمات کو پہلی بار دیکھنے کی خوشی کیسے برداشت کر سکوں گا ؛ کیا میں اپنے عزیزوں کو جن کی تسیریں آوازیں میری تاریکی کی کثافت کو لطیف بنا دیتی ہیں۔ دیکھ کر زندہ رہ سکوں گا! یا اگر معاملہ دگرگوں ہوا۔ تو اس قدر تکالیف و مصائب اٹھانے کے بعد یہ صدمہ کیسے برداشت کروں گا۔ کہ اب میں کبھی بصارت حاصل نہیں کر سکتا!

اس کے قریب مستورات سراپا اضطراب بنی کھڑی تھیں ان کی آنکھوں میں خود بخود آنسو بھرے آتے تھے۔ وہ متعجب تھیں کہ اس کا یہ تامل کیسا ہے، اور بینائی سے منتظر تھیں۔ کہ وہ پٹی کھولے، اتنے میں وہ بولا "و نہیں۔ اماں مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ مجھ میں جرات نہیں۔ بہتر ہوتا۔ کہ میں اس پرخطر تجربے میں نہ پڑتا۔ میں پہلے مطمئن تھا۔ خاصا خوش تھا۔ لیکن اب اس قدر مصائب اٹھانے اور تکالیف جھیلنے کے بعد بھی میری مقدر میں

سوائے تاریکی کے اور کچھ نہ نکلا! تو اماں پھر مجھے زندگی بھر کبھی خوشی یا اطمینان نصیب نہ ہوگا"۔

اس کی ماں کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو اُبل آئے۔ اُس نے بیٹے کے سر پر شفقتِ مادرانہ کا سکوں ریز ہاتھ پھیرا۔ اور اسے تسلی دی۔ اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے جوش سے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ اور سر جھکا کر پھر تعجب کے عمیق سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

وہ اپنے تفکرات میں محو اپنے آپ کو مخاطب کر کے آہستہ سے بولا" میں کیسے سمجھوں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ میں نے تم کو پھولوں اور چڑیوں کا، خوبصورت رنگوں کا، سورج، چاند ستاروں کا اور آسمان اور سمندر کا ذکر کرتے سنا ہے۔ آہ لیکن میں صرف چڑیوں کے چہچہے اور پانی کی روانی کو ہی سن سکتا ہوں۔ اماں۔ میں اگر ان چیزوں کو دیکھوں تو مجھے ڈر تو نہ لگے! آیا اگر مجھے بینائی حاصل ہوگئی تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کرسی میں بیٹھا بیٹھا کانپ گیا۔ پھر بولا" میں اسے کیسے برداشت کرسکوں گا؟

اس کی ماں اور بہن نے اسے تسلی تشفی دی۔ اور اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

کچھ دیر کی متفکر خاموشی کے بعد وہ مصمم آواز میں بولا" لیکن جب مجھے اس خطرے میں پڑنا ہی ہے۔ تو پھر مجھے ایک مرد کی طرح اس کو برداشت کرنا چاہیے۔ میں اسے تنہا برداشت کرونگا۔

ماں بیٹیاں تعجب سے بولیں تنہا"!

اس نے جواب دیا کیوں نہیں۔ انسان تنہائی میں اچھی طرح عبادت کرسکتا ہے۔ انسان صرف تنہائی ہی میں خدا تعالٰی سے دلی تعلق ہی استوار کرسکتا ہے میں بھی تنہائی ہی کو پسند کرونگا۔ میرا آخری فیصلہ ہے کہ آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔

ماں نے اس کو منع کرنا چاہا اور کہا" لیکن شوکت۔"

مگر اس نے درشت آواز میں بات کاٹ کر کہا" اماں تمہیں اچھا معلوم ہوگا۔ کہ تمہارے سامنے میری تحقیر ہو۔ میں خوف اور ڈر کے باعث کوئی مضحک حرکت کر بیٹھوں گا۔ میں اپنے پیاروں کے سامنے اپنی تحقیر

برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں؛

وہ دونوں اس مرضی کی تعمیل کرنے کی ایسی عادی ہوگئی تھیں۔ کہ انہوں نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ اور اس کے کہنے کے مطابق مجبوراً اسے تنہا چھوڑ دیا۔ وہ اٹھ کر دروازے تک ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ ان کے گزر چکنے کے بعد اس نے کہا کہ وہ دروازے کے قریب بھی نہ ٹھیریں۔ اور دروازہ کو چٹخنی لگا کر واپس آگیا؛

جب وہ تنہا رہ گیا۔ تو اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد فوراً پٹی کھولنی شروع کر دی۔ مگر اس کے کمزور ہاتھوں کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ پٹی کی گرہ نہ کھول سکا۔ اور وہ شخص جو ایک چوتھائی صدی اپنی بینائی کے متعلق صبر سے کام لیتا رہا تھا بے صبری سے چیخ اٹھا۔ گرہ کھولنے کی کشمکش میں اس کا سر کمرے کے ساز و سامان میں سے کسی چیز پر لگا۔ اور گو اسے ایسی چھوٹی چھوٹی تکالیف اٹھانے کی عادت تھی۔ مگر وہ ایک بچے کی طرح زور سے چلّا دیا؛

گرہ کھل گئی۔ اس کا سانس بے انتہا تیزی سے چل رہا تھا دل ہوا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ پس و پیش کے بعد ہاتھ کی آخری جنبش سے پٹی کو علیحدہ کر دیا۔

اس کے مُنہ سے ایک ایسی چیخ نکلی۔ جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

وہ دیکھ سکتا تھا!!!

اس کی آنکھوں کے پپوٹے اکڑے ہوئے تھے۔ اور دُکھ رہے تھے۔ پلکیں اوپر نیچے ہونے بس چرچر بول رہی تھیں۔ لیکن وہ دیکھ سکتا تھا۔ اس شاندار تعجب انگیز واقعہ میں کچھ کلام نہیں کہ اس کو قوت بینائی حاصل ہوگئی تھی!!!

شروع شروع میں اسے ایک زردسی کُہر دکھائی دی۔ جس میں عجیب و غریب غیر متشکل دھبے سے تیر رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ غبار صاف ہوتا گیا۔ وہ دھبے زیادہ واضح ہوگئے۔ انہوں نے

خاص خاص وضعیں اور شکلیں اختیار کرلیں۔ روشن دنیا اپنے تمام طلسم اور سحر کے ساتھ اسے دعوت نظارہ دے رہی تھی۔

اس کو ایک تیز چکر آیا۔ اور وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے دیوانہ وار اپنے ہاتھ یوں پھیلا دئے۔ گویا ان مختلف شکلوں اور رنگوں کے خطرات سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔ جنہوں نے چاروں طرف سے اسے گھیر رکھا تھا اور اس کو پریشان کر رہے تھے۔ وہ ڈرتا ڈرتا کھڑکی کی جانب ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بے انتہا خوف زدہ تھا اس کے بدن کا رواں رواں کھڑا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اٹھے دروازہ کھول دے۔ اور چیخ مار کر اپنی ماں اور بہن کو پکارے۔ لیکن اب اس کی وہ حس بیحد کمزور ہوگئی تھی جس سے وہ اپنا راستہ تلاش کیا کرتا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ چاروں طرف کی ان سفیدیوں میں جو اس کے سامنے موجود تھیں۔ دروازہ کون سا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اس کا دل چاہا کہ چیخے چلائے۔ لیکن اس کی آواز سینے کی گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔ اور بیخودی کی ایک عجیب وغریب سنسناہٹ نے اسے صوفے کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے سوا کچھ نہ کرسکتا تھا کہ خاموش بیٹھا کانپے۔ اپنی رگوں میں خون کے تیز دوران کو اور اپنے ہول کھائے ہوئے دل کی دھڑکن کو سنے۔

۶

رفتہ رفتہ اس کے خوف اور ڈر کا طوفان سرد پڑنا شروع ہوا اس کے دل کی دھڑکن ہلکی پڑ گئی جسم کی سنسناہٹ دور ہوگئی اور وہ آہستہ آہستہ سیدھا بیٹھ گیا۔ اب اس کی یہ خواہش نہ تھی کہ وہ اپنی ماں یا بہن کو اندر بلا دے۔ اس پر دماغی سکون کی ایک ایسی حالت چھا رہی تھی۔ جو خوشی یا غم کے جذبات سے متاثر نہ ہو سکتی تھی۔ صوفے کے قریب ہی میز پر ایک پھولدان رکھا تھا۔ جس میں گلاب کے چند تازہ پھول اپنے پورے سحر اور دلفریبیوں سے اسے دعوت گل چینی دے رہے تھے اس نے انہیں دیکھا اس کا دل اچھل پڑا۔ بے اختیاری سے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ مگر اسے ڈر لگا کہ نہ معلوم نہیں چھونے

کا احساس کیا ہوا اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔۔۔ کھڑکی میں سے پرندوں کے چہچہانے کی آواز آئی۔ اپنی قدیم رفیق آواز کی رہنمائی سے اس نے باہر جھانکا۔ ایک درخت تھا گنجان جس کے پتے ہل رہے تھے۔ اور جس پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں اس نے شوق سے درخت کو دیکھا۔ لیکن وہ معلوم نہ کرسکا کہ درخت کے پتے وہ چڑیاں تھیں جو گا رہی تھیں۔ یا وہ گانے والی چیز اس کی نظر سے اوجھل ہے!

درخت سے اُچٹ کر اس کی نگاہ اس سرسوں کے کھیت، سبزے اور آزادی کے سمندر پر پڑی۔ جو ہوا کے جھونکوں سے متلاطم تھا۔ وہ غور کرتا رہا کہ یہ کیا چیز ہے؟ بہت سوچنے کے بعد اس نے نتیجہ نکال لیا۔ کہ یہ اتنی دور تک پھیلی ہوئی چیز کھیت ہی ہوگی۔ کیونکہ اس نے لوگوں سے سنا تھا۔ کہ اس کے گھر کے چاروں طرف کھیت ہیں۔ مگر اس نے تعجب سے اس تغیر کو دیکھا کہ یہ کھیت دور (افق پر) جاکر اور طرح (رنگ) کا ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ بلند ہوتا ہوا تمام چیزوں پر چھا جاتا ہے:۔

اتنے ہی میں ایک لڑکا کھیت میں بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ جو فوراً ہی نظر سے غائب ہوگیا کیا یہی انسان ہے؟ اور پھر کانپنے لگا۔ اس کا دل پھر دھڑکنے لگا۔ وہ پھر صوفے میں دبک کر بیٹھ گیا:۔

اس کو آئینے کا کوئی خاص فہم نہ تھا۔ ڈاکٹر سین کی ہدایتوں میں ایک ضروری ہدایت یہ بھی تھی۔ کہ شوکت کو ایک کافی عرصے تک آئینہ دکھایا جائے۔ اور جب اسے اپنی تازہ حاصل کردہ قوت بینائی کے استعمال کرنے کی عادت ہو جائے۔ اور وہ اپنی نظر سے فاصلے کا اندازہ کرنے اور انحراف روشنی کے اصولوں کو سمجھنے لگے تب آئینہ دیکھے۔ کیونکہ سین بابو کا تجربہ تھا کہ ایسے انسان آئینہ دیکھتے ہی دیوانے ہو گئے ہیں۔

(۷)

تھوڑی ہی دیر کے بعد ماں اور بہن جن کے تفکرات کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ اس کی ناراضگی کے خیال سے ڈرتی ڈرتی دروازے پر آئیں اور آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکٹایا۔ اس نے کھٹکے کو سُن لیا۔ وہ اس کا مطلب جانتا تھا۔ اس نے تعجب سے اس جگہ کو دیکھا۔ جہاں سے یہ آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اور سمجھ لیا کہ یہ دروازہ ہے۔ یہ اس کی پہلی واقفیت تھی جس کے صحیح ہونے کا اسے یقین نہ تھا اس نے اپنے اور دروازے کے درمیان کے فاصلے کو نہایت نقادانہ نگاہ سے دیکھا اور زمین پر ہاتھ رکھکر راستے کے فرش کو چھونے کا احساس معلوم کرنا چاہا۔ اس کی ماں نے پھر دروازہ کھٹکٹایا اور اسے آواز دی۔ اس نے جواب دیا " اماں ابھی نہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں مگر اماں تمہیں کیسے دیکھوں گا . . . . "

اس نے سنا کہ اس کی ماں کے لبوں سے خوشی کی ایک دیوانہ وار چیخ سی نکل گئی ہو ؛

ماں نے دروازہ کھولنے پر اصرار کیا۔ مگر شوکت کی جرات نہ پڑی اور جب ماں کے رخصت ہوتے ہوئے مایوس قدموں کی آواز غائب ہو گئی۔ تو وہ جرات کر کے نہایت احتیاط سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن اپنا وزن قائم نہ رکھ سکا۔ اپنے ہاتھوں کے بل گر پڑا۔ چوپائے کی طرح چل کر ایک دیوار کے کونے تک گیا۔ اور وہاں پھر ڈر کر دبک گیا۔ ڈر کی لہر ایک دفعہ پھر اس کے جسم میں سے گذر گئی اور پھر آہستہ آہستہ بالکل اسی طرح جیسے پھولوں کی پتیوں پر اوس بنتی ہے۔ اس پر ایک سرد سکون چھا گیا ؛

ذرا سی دیر کے بعد ممتا کی ماری ماں پھر آئی۔ اور اس نے دروازہ کھٹکٹایا۔ مگر اس نے پھر وہی کہا " اماں ابھی نہیں "!

اس نے سنا کہ وہ بار بار بے حد اشتیاق سے اس کا نام لے کر اسے پکار رہی ہے۔ اور

اس کی منتیں کر رہی ہے۔ لیکن وہ سمجھتا تھا۔ کہ ابھی مجھ میں جرات نہیں۔ کہ اپنی ماں کو دیکھ سکوں
وہ خوشی کے اس جذبے کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ جو اپنی پیاری . . . .
ماں کو پہلی بار دیکھنے سے اس پر گزرے گا :

اس کی تازہ بصارت کے ڈر اور خوف کی تیز دھار کند ہو تی گئی۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش اور چپ چاپ بیٹھا عالم خیال کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ اس کے تخیل میں ایک اضطراب اور آشفتگی کی ہلچل مچ رہی تھی۔ جس میں کبھی ماں کا خیال کبھی بہن کا خیال۔ کبھی کسی دوست کا تصور اور کبھی مختلف دور دراز چیزوں کا خیال جھلکنے لگتا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس کو بہت دیر ہو گئی :

اس کی ماں بار بار آتی تھی۔ اور وہ ہر دفعہ اسے مایوس واپس بھیجتا تھا۔ گو اس کی بہن نے اس کے ظلم پر اسے بہت لعنت ملامت کی۔ مگر وہ متاثر نہ ہوا۔ اس نے دل میں سوچا "اس دفعہ دروازہ کھول دوں گا اور شوق سے مسکرا دیا . . . . لیکن اس کا تبسم اس کے چہرے پر سے یوں دفعتاً غائب ہو گیا۔ جیسے کوئی کھولنا لگا ہو۔ یہ کیا ہو رہا تھا! اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور آہستہ سے آنکھیں ملیں۔ کیونکہ ان میں اب تک درد اور جلن باقی تھی وہ جلدی سے اٹھا۔ اور پھر صوفے پر آ پڑا۔ وہ گھور گھور کر باہر کے منظر کو دیکھنے لگا۔ ہر چیز پر ایک بخار سا چھایا ہوا تھا۔ کنارے دھندلے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔ اور صاف نہ دکھائی دیتے تھے۔ وہ ابھی ابھی جس درخت کو صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ اب اس کی وضع و شکل دھندلی دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ محض ایک بڑا سا دھبہ معلوم ہو رہا تھا۔ سرسبز کھیت جو کچھ دیر پہلے خوب لہرا رہا تھا۔ اب سست سست دکھائی دیتا تھا۔ ہر چیز میں بے حد تغیر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ صوفے پر گر پڑا۔ بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ اور اس کی بے چین نگاہیں چاروں طرف کمرے میں پھرنے لگیں۔ دیواریں۔ کرسیاں۔ میز۔ پھول سب ایک دھندلی کہر میں ڈوبے جا رہے تھے!

آہ! کیا نابینائی پھر عود کر رہی تھی!

اس نے اپنی دکھتی ہوئی آنکھیں بار بار کھولیں اور بند کیں۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس وقت اسے بنگالی ڈاکٹر کے وہ الفاظ یاد آئے۔

"ممکن ہے بصارت تھوڑے عرصے کو بحال ہو۔ شاید گھنٹوں کے لئے چند لمحوں کے لئے!"

اس کے دل پر ایک تیر سا لگا۔ وہ اپنی از خود رفتگی میں اس خوفناک امکان کو بھولا ہوا تھا۔ اس کی تمام امیدوں کا گلا گھٹ گیا۔ تصورات وتخیلات کا حسین وخوبصورت بلبلا پھٹ گیا۔ وہ اب پھر مجبور تھا۔ کہ اپنی اسی قدیم تاریکی میں واپس جائے اسی تاریک وادی میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ دلفریب دنیا کا یہ مختصر سا نظارہ اور ہمیشہ کے لئے مایوسی! عجائبات عالم کا اتنا ذرا سا انکشاف اور ہمیشہ کی محرومی! روشنی کی اتنی سی سیر اور پھر وہی تاریکی" ویران تاریکی، سنسان تاریکی، گھٹا ٹوپ تاریکی، جو اب قبر تک پیچھا نہ چھوڑے گی۔

اس کی آنکھوں کا نور تیزی سے گھٹ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ایک زرد کی چیخ نکلی۔ اور وہ اٹھ کر ایک بار پھر اپنی پرانی رفیق تاریکی میں راستہ ٹٹولتا ہوا دروازے کی طرف چلا۔ اس کے قدم کانپ رہے تھے۔ جسم لرز رہا تھا۔ اور اس کو یقین تھا۔ کہ یہ صدمہ اس کا کام تمام کرنے کو ہے۔ دروازے کی چٹخنی اس نے کھولی۔ اس کی درد وکرب کی بلند آواز ملول خاموشی میں گونجی صرف ایک دفعہ گونجی اور وہ گر پڑا۔

(۸)

جب وہ ہوش میں آیا۔ تو اس نے سمجھا۔ کہ وہ سرزمین حیات کا تمام تاریک اور مختصر سا روشنی کا سفر طے کر کے اب اس دنیا میں پہنچ چکا ہے۔ جس کی روشنی سے کسی بدبخت کی آنکھ محروم نہیں کی جاتی کیونکہ

اب وہ دیکھ سکتا تھا!!!

ایک ہلکی، نورانی، شگفتہ روشنی سے، ایک لطیف طوفان نور سے فضالبریز تھی۔ اور اس کے قریب ہی ایک متفکر چہرہ، جو گویا اس کے دل کے نازک سے نازک جذبات وحسیات کا زندہ موجود تھا۔ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شبیہ بولی "میرے پیارے تم دیکھ سکتے ہو؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا "ہاں اب کہ میں مرچکا ہوں۔ میں پھر صاف دیکھ سکتا ہوں" ؛

اس شبیہ کا جسم کانپا۔ اس کی آنکھوں میں وہ آنسو اُبل آئے۔ اور مریض کی پیشانی پر گر کر موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ وہ آہستہ سے ایک خود فراموشی کے عالم میں اُٹھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دئے اور اس کے سینے سے لپٹ گیا ؛

وہ بولی "میرے پیارے شوکت تم زندہ ہو۔ اور اپنی اسی دنیا میں ہو۔ آہ یہ تمام پریشانی صرف ایک بات سے ہوئی۔ یہ میری غلطی تھی۔ جو میں نے تم کو نہ بتایا۔ مگر مجھ میں اتنی سمجھ کہاں تھی کہ میں اتنی دوراندیشی کرتی"۔

اس نے نقاہت کی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے میں نے کوئی پریشان خواب دیکھا تھا۔ اور اب بھی خواب دیکھ رہا ہوں"۔

اس کی ماں نے اس کو تسلی دی اور کہا "نہیں تمہاری بصارت درست ہوگئی ہے" ؛

اور سرہانے کی طرف سے بہن کے نازک اور محبت کے نشے میں چور ہاتھ اس سے لپٹ گئے اور وہ بولی "میرے پیارے بھائی یہ نابینائی واپس نہیں آتی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا، جب رات آتی ہے۔ تو روشنی ختم ہوجاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہی تو تاریکی اور روشنی کا فرق ہے" ؛

اور دوسری شام آنے تک وہ اسے دن اور رات، روشنی اور تاریکی کی آمد ورفت کی نسبت کچھ علم نہ دلا سکیں

سید امتیاز علی تاج

عشق کی خودکشی

مفصلہ ذیل تحریر کے پندے جیلخانے کی اس کوٹھری میں پائے گئے جہاں میرا دوست قاسم پھانسی پانے سے پہلے محبوس تھا، اور مجھے سعادت علیخاں داروغہ جیل کی مہربانی سے دستیاب ہوئے ہیں، قاسم جسکی زندگی شوق اور کیف کے سرچکرا دینے والے جذبات سے معمور تھی۔ آج دوسری دنیا میں ہے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ اپنی محبوب بیوی رضیہ کو بھیج چکا تھا، خدا ان دونوں کی روحوں کو عافیت عطا فرمائے۔ (راشد)

(۱) شاید مجھے داروغہ جیل کا شکرگذار ہونا چاہئے، کہ اسکی اجازت سے میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں، لیکن میرا دل اسوقت جذبات سے بالکل خالی ہے، میرے دل کی اسوقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے، جب سحر کی پھیکی روشنی اور انکان کی خواب آلود سکون مشاغل شبانہ کی ہوسناکیوں اور عشرتوں کو بیرنگ اور بھیانک کر دیتا ہے، میرا دل ایک کھنڈر ہے، جس میں زندگی نہیں، آثار ہیں۔ جہاں حال بیدار نہیں، ماضی خفتہ ہے۔ جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ، فقط ایک ویران سی گونج ہے، جسکے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں، جو نوائے زندگی اور غلغلۂ حیات نہیں، ایک خندہ بے مسرت۔ ایک فریاد بیداد ہے

کل مجھے قانون کی انتہا سزا دیجائے گی، میں اسکے لئے تیار ہوں، ہر شخص اس کے لئے تیار ہوتا ہے موت ناگہانی موت ہے، موت کا وقت معین ہے، اور اس طرح معین کیا گیا ہے کہ بموقع آئے، اگر ہمیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو۔ تو ہماری تمام زندگی اس موت ہی کی تیاری میں صرف ہو جائے زندگی اس قیام کی مانند ہو، جو ریل کے سٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کیا جاتا ہے،

(۲) انسان کی ہستی فوری ضروریات اور فوری انتظامات کا ایک اجتماع ہو، جس میں عشق کی ناپائیداری

حسن کی بیوفائی کیطرح ہو ۔ جہاں تعمیر ایک غلطی ہو، جہاں اعتماد ایک حماقت ہو،

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے ۔ اس لئے میں نے جو کچھ تعمیر کیا تھا، اسے منہدم کر چکا ہوں مجھے اس تخریب میں بہت کم تکلیف ہوئی ہے ۔ میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی میری آرزوؤں کے محل ۔ میری توقعات کے قصر، میرے ارادوں کے قلعے سب بلند اور شاندار تھے، لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا ہے کہ سب کی بنیادیں نہایت کمزور تھیں،

شروع میں جب میں نے مجرم ہونے سے انکار کر دیا تھا، تو اکثر لوگ مجھے سچا جانتے تھے، انکو یقین تھا کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا ۔ ارشد بھی مجھے بیگناہ سمجھتا تھا، حالانکہ وہ مجھے کتنی مدت سے جانتا ہے، ایسے لوگ مجھ پر رحم کھاتے تھے، اور مجھ سے ہمدردی کرتے تھے،

چند ایسے بھی تھے، جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے، ان کا گمان مجھے حقیر جانتے تھے،

یہ دونوں غلطی پر تھے، میرے اعتراف جرم کو دیوانگی سمجھنے والے سُن لیں، کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے، اسی دائیں ہاتھ نے جو اس وقت خامہ فرسائی کر رہا ہے ۔ رضیہ کے نازک گلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اسکے سانس کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے، میرے انکار جرم کو میری بزدلی اور دروغگوئی سمجھنے والے سُن لیں، کہ جب میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر بلا تامل کہدیا تھا، کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں، تو میرے دل اور زبان میں وہی سچائی تھی، جسنے مجھ سے بعد میں اعتراف کرا دیا ۔ میں ایک نہیں، دو ہوں ۔ شاید میں دس بیس ہوں، مجھے اب اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں احساس ہو رہا ہے کہ میری ایک تنہا ہستی میں کس قدر کثرت تھی، رضیہ کو چاہنے والا ہی انسان تھا، جواب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے میں کیسے مانوں ؟ اگر میں ایک ہوں، تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے رضیہ کو اسلئے قتل کیا ۔ کہ مجھے اس سے محبت تھی، یہ کتنی لغویات معلوم ہوتی ہے، لیکن نہیں یہی ٹھیک ہے، سب کچھ ٹھیک ہے، کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی ۔ میں سب کچھ ہوں مجھے نہیں معلوم

میں کیا ہوں ۔ شائد میں نے غلطی کی ہے، میں ایک کمزور انسان ہوں ۔ سب انسان کمزور ہوتے ہیں "

(۳۳) دو سال ہوئے ۔ میں اور رضیہ بیاہے گئے ۔ اسکے سنگدل والدین نے اب تک اسے معاف نہیں کیا، میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو "اوباشی" سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی، اگر ہمارے محلے میں حسن اسقدر کمیاب نہ ہوتا ۔ تو شائد چند اور والدین بھی اسوقت اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتے، لیکن وہ سمجھتے ہیں، کہ ان کے ناموں کہنے کی وجہ ان کی اولاد کی عصمت شعاری ہے کیا شاعرانہ خیال ہے! وہ اپنی لڑکیوں کی نیک خصالی پہ فخر کرتے ہیں ۔ اس صفت پہ فخر کرتے ہیں ۔، جو مردوں کے وہم تخیل نے عورت کو بخشدی ہے" ان سے کہہ دو جو مجھ سے بچ گئے ہیں کہ اصل وجہ انکی لڑکیوں کی پاکبازی نہیں ، میری عالی نگاہی تھی، جو ان میں سے کسی کو بحیثیت بیوی کے گوارا نہ کرسکتی تھی، یہ نقادانِ اخلاق سمجھتے ہیں کہ میں نے رضیہ کو اسکی بدچلنی کی وجہ سے مار ڈالا ۔ اور خدا! جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو محض ایک قتل کے بدلے کیوں ؟ میں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں ؟

رضیہ کو کس نے مارا، شائد میں نے ۔ یہ نہ کہو ۔ تم رضیہ سے جاکر پوچھ لو ۔ وہ کبھی میرا نام نہ لیگی ۔ وہ کبھی یقین نہیں کرسکتی ۔ کہ میں نے اسے قتل کیا ہے ۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے، کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا ۔ تم یقین جانو کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی، محض میری خاطر اس نے تمام جہان کے الزامات اپنے سر لئے! دنیا بھر کے مصائب اسنے میرے ساتھ ملکر برداشت کئے، ٹھیک وقت پر میرے لئے کھانا تیار کرنا ۔ اور بڑے اہتمام سے میرے بستر کو بچھانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی، گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی ۔ رات کو بڑی دیر تک میری انتظار میں جاگتی رہتی ، ہائے یہ نہ کہو ۔ کہ میں نے اُسے

مارا ہے، یہ جھوٹ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ پوچھ لو۔
عورت اگر چاہے، تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے، فطرت نے دلوں کے توڑنے کے
جس قدر بھی ڈھنگ ہیں، وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل محض اسلئے
بنائے ہیں۔ کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لئے ہیں۔ کہ یا
ہم ان کو دیکھیں یا ان کے لئے روئیں۔ عورت کو خراج نگاہ چاہیئے، یا خراج اشک، اسی دولت
سے وہ کشورِ دل پر حکمرانی کرتی ہے۔ ان کا عہد ایک دور ظلم ہوتا ہے اور ایک عہد ستم۔

جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں۔
میں نے رضیہ سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا۔ کہ وہ مجھ سے محبت کرے،
وہ برف تھی میں نے چاہا اسے آگ بنا دوں، وہ برودت تھی۔ میں چاہتا تھا حرارت ہو، وہ چپ
چاپ پانی کی طرح بہتی تھی، میں اسے شعلوں کی طرح بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں رات کو خاموشی میں بارہا
گھنٹوں تک متواتر اسکے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے لمبے درد بھرے فقروں میں اس سے
اپنے عشق کی داستان کہتا، اسے دیوی سمجھ کر پجاریوں کی طرح اسکی پوجا کرتا، وہ بت کی طرح بیٹھی رہا
کرتی میں اس سے کہتا" اے میرے دِل پر حکومت کرنے والی ملکہ۔ میں تیرا ایک ادنیٰ غلام
ہوں، تیری خدمت کرنا میرے لئے جنت میں زندگی گذارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟"
وہ کچھ نہ بولتی میں اسکی باہیں مروڑتا۔ جب بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار
ظاہر ہوتے مجھے خوشی حاصل ہوتی، کیونکہ اس پر بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ تم کہوگے شرم کی وجہ سے ابتم
کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے، تمہیں نسوانیت کا کچھ علم نہیں، تم صرف مرد ہو، تم میں
مردانگی نہیں۔ تمہاری تمناؤں میں بلندی کی قابلیت نہیں۔ تم کو چھوٹی چھوٹی باتیں خوش کر سکتی ہیں
او کم ظرف انسانو تم مجھے کچھ نہ کہو،

(۴) کئی دفعہ میں رات کو دیر میں گھر آیا۔ اسنے کبھی اسکا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے، میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا۔ رضیہ۔ میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟" وہ کہتی "آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے، تو تمہارے لئے اطمینان کا باعث ہو۔ شاید تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے، کہ جسے تمہاری کوئی بات ناپسند نہیں۔ اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کبھی نہ سوچو۔ کہ وہ کونسا مشغلہ ہے جو تمہاری غیر حاضری کو اس کے لئے بے معنی بنا دیتا ہے، تم کیوں سوچو۔ تمہیں عورتوں کا تجربہ نہیں، تم میں غیرت نہیں،

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ رضیہ۔ جب تم میری ہو۔ تو پھر یہ کیا ہے۔ کہ تم میرے ہوتے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پرونے میں صرف کر دیتی ہو، تم مجھ سے باتیں کیا کرو"۔ وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اسکی سب کتابیں پھاڑ ڈالیں۔ میں نے اس کے کپڑے جلا دئے، وہ روتی رہی اور کھانا پکاتی رہی، ان کتابوں اور کپڑوں کے لئے روتی رہی۔ جنکو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔ میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا۔ لیکن جلد غائب ہو گیا، اور میں مٹھیوں کو بند کر کے رہ گیا، وہ دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے مجھے نہ منایا، تم کہوگے۔ ڈرتی تھی، پھر تغافل کسے کہتے ہیں۔

کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے، جس پروانے کو شمع کے جلتے ہوئے مر جانا چاہئے تھا۔ وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی خامی ہے، رضیہ تم مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں دنیا میں میں نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی۔ تو اس کا الزام مجھ پر نہیں عائد ہوتا۔ وہ اسی قابل تھیں۔ کہ ایک رات کے لئے بدر منیر ہوتیں اور بس۔ ان کو چند لمحوں کے مشغلے سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا مذاق سلیم کا خون کرنا تھا، اسپر بھی اگر اہل دنیا مجھے قصوروار سمجھتے ہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں، وہ مجھے کل مار ڈالیں گے،

اس سے زیادہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں، افسوس ہ
اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائیگا۔ تو اب تاکردہ گناہوں کی حسرت دل میں نہ ہوتی
کسی سے کوئی ایسا پیمان نہ باندھتا۔ جسکو توڑتے ہوئے میرے دل کو ذرا بھی رنج ہوتا میں رضیہ
سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جسکی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا، جس نے چپ کے
سوا کبھی دوسرا جواب نہیں دیا۔ جس نے دل کا حال ہمیشہ مجھ سے چھپایا۔ جسے میرے مشتعل جذبات
کے روح سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جسے میرے عشق کے ننا انجام زلزلے کبھی نہ ہلا سکے، اس سے شادی
کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودھویں کی چاندنی میں وہ سفید لباس پہنے ٹھک کر لیٹی ہوئی تھی، اور میں اسکے پاس بیٹھا ہوا
اپنے دل کی بیقراری کو کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لرزتے ہوئے فقروں میں بیان کر رہا تھا، رضیہ
تم نے مجھ پر یہ کیا جادو پھونک دیا ہے، کہ میرے جسم میں کوئی روح ہے۔ تو وہ تم ہو۔ میری زندگی
میری ماحیت، اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوشی پاؤں۔ رضیہ
صرف تمہارے ہوتے ہوئے، میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اٹھتی ہیں، ارزوؤں کا ایک تلاطم
بپا ہوتا ہے، تمناؤں کا ایک کہرام مچ جاتا ہے، تمہیں ایک دفعہ دیکھ لینا ساز ہستی کے تمام تاروں
کو یوں چھیڑ دیتا ہے۔ جیسے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گذر گیا، میرے دل میں نغمے گونجتے
ہیں۔ کہ تو اُن کو سُنے۔ کیا تو سنتی ہے؟" وہ کچھ بولی۔ میں نے کہا۔ "رضیہ سنتی ہے" کہنے لگی
سنتی ہوں"۔ میں نے کہا۔ کیا تمہارے دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتیں؟"
وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت انکسار سے کہا۔ "رضیہ کچھ تو کہہ" اس نے
کچھ نہ کہا۔ یا شاید یہ کہا کہ میں کیا کہوں۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، اس کے چہرے
کی بے پروائی کو دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اسکے گلے کے

قریب آتے گئے۔ میری انگلیوں کو ایک زبردست خواہش نے فولاد بنا دیا۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں میں سے کٹ گیا میرے دائیں ہاتھ کا پنجہ سکڑتا گیا، اسنے آنکھیں کھولدیں۔ مجھے اس کی نظروں میں وحشت نظر آئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اور وحشی ہوگیا، میرے پنجے کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ اُس نے کچھ کہا لیکن اس کے کہنے میں الفاظ نہ تھے، میں اسکا گلا بھینچتا گیا۔ حتیٰ کہ میرا ہاتھ تھک گیا یہاں تک کہ اسکا اور دنیا کا تعلق منقطع ہوگیا۔ مجھے چاند تاریک دکھائی دینے لگا میری نگاہ میں ایک سیاہ سی سرخی پھر گئی میرا گلا خشک ہوگیا، میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے لپٹ گیا۔ چلا چلا کر پوچھتا رہا کہ رضیہ۔ میری جان۔ تم کیوں چپ ہو، تم کو کس نے مار ڈالا ہے۔ رضیہ میری رضیہ۔ تمہارا قاتل کون ہے؟" وہ کچھ نہ بولی "

(۶) وہ بیچاری مرگئی۔ میرے ہاتھوں سے مرگئی، میں نے اسے مارا، میں کل مرجاؤں گا۔ اس نے میرا دل دکھایا، میں اس کے لئے مرتا تھا۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی، خدائی قوانین کی گرفت مضبوط ہے، اور ان سے رہائی مشکل۔ مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ اسکی خواہشات کی تکمیل بطریق احسن ہو۔ وہ اسکی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیوانگی کا سحر کرنا جانتی ہے۔ راحت کی نیند سلانا نہیں جانتی۔ اندھا کر دیتی ہے۔ اپنے نزدیک آنے کا رستہ نہیں بتاتی۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا۔ کہ مجھے خوش کرے، میں نے اسے مار ڈالا، کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی۔ کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے عورت کی محبت ایک افسانہ ہے۔ روح جسم کا دوسرا نام ہے، جذبات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے، آج تم کچھ ہو، کل خدا جانے کیا ہوگے؟

"قاسم"

پطرس

گناہ کی قربانی

اُس نے سر کی ایک جنبشِ تمکنت سے اپنے سیاہ چمکتے ہوئے بالوں کو ماتھے پر سے ہٹا کر اپنی آنکھوں کی کشش کو ایک ناقدانہ نگاہ سے دیکھا اور پھر کہا۔ "کون ہے جو مجھ سے محبت نہیں کریگا"

وہ آئینہ خانہ میں بیٹھی تھی۔ ایک قدِ آدم آئینہ اس کے روبرو تھا۔ جس میں اس کے حسن کی تمام رنگینیاں جذب ہو رہی تھیں۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا شنجوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ جس کی باریک تہیں اسکے صبیح جسم کو اس طرح نمایاں کر رہی تھیں جس طرح ایک بلوری کنٹر میں شراب جھلک رہی ہو۔ ہرچند کہ وہ ایک مصری ماں کی لڑکی تھی۔ لیکن اُس نے وہ کھلتا ہوا سانولا رنگ نہ پایا تھا۔ جو مصری عورتوں کے لئے مخصوص ہے اس کا حسن حسن فرنگ کہلائے جانے کا مستحق تھا۔ وہی حُسنِ فرنگ جس کی تعریف میں ایران کے شاعروں نے دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسکے ترچھے ہوئے نقش و نگار نے دمکتے ہوئے کندنی رنگ کے ساتھ ملکر اس شراب کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

طاقت بنفسہ خطرناک ہے مگر جب صاحبِ طاقت کو یہ بھی معلوم ہو جائے۔ کہ وہ طاقت رکھتا ہے تو اس کے بے پناہ اثرات کا کچھ ٹھکانا نہیں رہتا۔ عائشہ کو معلوم تھا کہ وہ حسین ہے۔ اور کونسی حسین عورت ہے جسے معلوم نہ ہو۔ کہ وہ حسین ہے۔ مگر عائشہ اپنے حسن سے کام لینا جانتی تھی۔ بچپن سے اس نے ایسے مدرسے میں تعلیم پائی جہاں حسن بیچا جاتا ہے۔ اور خریدا جاتا ہے۔ زندگی اس کے لئے خوابِ تعیش کی تعبیر تھی۔ پہلا سبق جو اسے اس مدرسہ میں دیا گیا یہ تھا۔ کہ "دلوں کو اپنے ہاتھ میں لاؤ"۔ جس سرعت اور تن دہی سے اُس نے اپنے فرض کو پورا کیا۔ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ اس کے سمیں پاؤں پر طلائی ٹکیوں کے انبار لگ گئے۔ اُس نے اس روپیہ کا بہترین استعمال کیا۔ ہر وہ سامانِ عیش جو روپیہ دے کر خریدا جا سکتا تھا۔ مہیا کیا گیا۔ مشرق و مغرب کے نوادر دنیا کے کونوں سے ڈھونڈ کر لائے گئے

اور یوں اس کا دیوان خانہ ترتیب کیا گیا۔ وہ خوش تھی اور بہت خوش، کیونکہ ابھی تک اس کی زندگی کا مقصد حصول زر تھا۔ روپیہ کے نشے اور حسن کے غرور نے اس کو ہر ایک شے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ تھوڑا عرصہ اس پر یہی حالت طاری رہی۔ اس کے جذبات کی بے حسی تعریف اور خوشامد سے بھی بے نیاز تھی۔ مگر عمل کی اس کشاکش کا نتیجہ آخر کار ایک زبردست ردّ عمل کی صورت میں نمودار ہوا۔ اگرچہ وہ احساس کرتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کے حسن کی بدولت ہے۔ مگر اس بے مصرف حسن سے جو ہر ایک کے لئے تھا۔ اور پھر کسی کے لئے بھی نہ تھا۔ وہ تنگ آ چکی تھی۔

عائشہ کی حیات نے کروٹ بدلی۔ اس کے جذبات کی سوئی ہوئی دنیا جاگ اٹھی۔ وہ بے حسی جو اس پر مدت سے طاری تھی۔ یکسر اضطراب ہو گئی۔ اس کے سینہ میں جذبات کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔ اس کو احساس ہوا۔ کہ اس کے شباب کی رعنائی ابھی تکمیل تک نہیں پہنچی پہلے وہ دولت و حشمت کو حسن ضروری عنصر تصور کرتی تھی۔ اب اسے حسن کی غربت پر رشک آنے لگا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں خلل پیدا ہو گیا۔ اسے ایک ایسے وجود کی خواہش ہونے لگی۔ جو اس کی دولت سے بے نیاز ہو کر اسے چاہے۔ جان و دل سے چاہے جو اس کے حسن سے مغلوب ہو جانے کے بعد بھی اس پر غالب رہے۔ جس کی بے پروا مردانگی اس کی نسوانی خصوصیات کو زیادہ شوخ کر دے زیادہ دلفریب بنا دے۔

پہلے پہل جب اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تو اسے غرور تھا کہ وہ جسے چاہیگی۔ اپنا بنا لیگی اس نے اپنے مکان کو ایک عشرت کدہ بنا لیا۔ جہاں ہر ایک شخص کے لئے دعوتِ عام تھی۔ اس تمام مجمع میں وہ اپنے مقصود نظر کو ڈھونڈتی۔ مگر اس کی حیات کو جنھیں دولت کا تکلف اور حسن کی نفاست تھی سخت صدمہ پہنچتا۔ جب وہ دیکھتی کہ ان تمام نام نہاد مردوں کے گروہ میں اظہار آرزو کے وہی عام طریقے رائج ہیں۔ جن میں اقدام گناہ کا شائبہ ہے۔ جن میں ابتذال کا عنصر ہے۔ وہ ان تمام باتوں سے

تنگ آچکی تھی۔ اس کا دل اس قسم کی زندگی پر ملامت کرنے لگ گیا۔ وہ رقص کرتی۔ اور اپنے شباب کے تمام کیف کو اپنے حسن کی تمام دعوتوں کو اپنے سیمیں پاؤں کی لرزشوں میں چھپا دیتی۔ سریلے گھنگروؤں کی جھنکار میں پنہاں کر دیتی۔ مگر ان اشاروں کا سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ آہ کوئی نہ تھا۔ ہوس کے متوالے دولت نچھاور کرتے تھے۔ وہ محبت چاہتی تھی وہ گاتی اور اپنے گانے میں ان تمام آرزوؤں کا اظہار کر دیتی۔ جن کے لئے اس کا بیچین دل تڑپ رہا تھا۔ ان گیتوں میں سوز ہوتا۔ درد ہوتا۔ اور لوگ حیران ہوتے۔ کہ اس عشرت کی دیوی پر کیا مصیبت آپڑی ہے۔

آخر کار نا امیدی نے اسے مغموم کر دیا۔ اس کی بلورین پیشانی پر غم و اندوہ کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اس کے قدم آمادہ لغزش تھے۔ مگر اس کا دل ہوس میں ڈوب جانے کے باوجود پاک تھا آخر کار محبت کے اندھے دیوتے نے ایک تیر چلایا۔ اور وہ عائشہ کے مضطرب دل میں پیوست ہوگیا۔ مگر اس کے تیر لگتے ہی جہاں عائشہ زخمی ہوئی۔ وہیں اس کے غرور کے جذبات بھر جاگ اٹھے۔

وہ اپنے محبوب کے خیال میں غرق بیٹھی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے جسم کے تناسب کو غور سے دیکھا۔ اور پھر دل ہی دل میں کہا۔" میں اسے کھینچ لاؤنگی۔ جیسے میری زلفوں کے کالے ناگ ڈسیں وہ نہیں بچ سکتا۔ اُف میں خود آئینے کو دیکھ کر بیخود ہوتی جاتی ہوں۔ مجھ میں یہ تغیر کس نے پیدا کر دیا۔ جواد نے۔ نہیں نہیں پہلے بھی ایسی ہی تھی۔ مگر میرا دل اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ جب سے اس نے یہاں آنا شروع کیا ہے میری حالت کچھ بدل سی گئی ہے۔ مگر جواد تو صفیہ کی طرف زیادہ راغب معلوم ہوتا ہے صفیہ سانولی صورت والی صفیہ۔ یاد رکھ۔ اگر تو میری راہ میں حارج ہوئی تو میں تجھے انہیں ہاتھوں سے اس طرح مسل دونگی۔ جس طرح ایک گلاب کی پتی کو۔"

یہ کہہ کے اس نے میز پر سے ایک بلورین گلدان میں سے گلاب کا ایک پھول نکالا اور

اُسے نوچ کر پھینک دیا۔ پھر اسے اپنے پاؤں سے مسلا۔ اور آئینے کے سامنے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

(۲)

ملحقہ کمرے میں دو شخص باتیں کر رہے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ مگر ابھی تک کمرے میں کوئی روشنی نہ کی گئی تھی۔ کمرے میں چاروں طرف سیاہ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ جو تاریکی میں سایہ نما صورتوں کی طرح مبہم اور خوفناک نظر آتے۔ جا بجا انگریزی طرز کے صوفے ایک خوشنما ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ زمین پر ایرانی غالیچوں کا ایک فرش تھا۔ چھوٹی چھوٹی میزیں بھی موجود تھیں۔ جن پر عجیب و غریب طرز کی منقش چادریں ڈال دی گئیں تھیں۔ دیواروں میں گہرے سبز رنگ کی الماریاں نصب تھیں۔ جن پر نہایت باریک کام کُھدا ہوا تھا۔ ایک طرف ایشیائی طرز کے طاقچوں میں طرح طرح کے رنگین بلوریں کنٹر گلاس اور طشتریاں سجائی گئیں تھیں۔

دونوں میں سے ایک نے جس کے لہجہ کی چستی جوان ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ کہا "سعید آج کمرے میں روشنی کیوں نہیں؟"

دوسرے نے جواب دیا "تمہاری باتوں میں ایسا محو ہوا کہ کسی بات کا خیال نہیں رہا"

پہلے شخص نے گہری آواز میں کہا "گناہ ہمیشہ تاریکی کو پسند کرتا ہے"

سعید نے آگے بڑھ کر بجلی کا ایک بٹن دبایا۔ تمام کمرہ بقعۂ نور ہو گیا۔ اور دونوں کے چہرے روشنی میں چمکنے لگے۔ سعید اوسط قد آدمی تھا۔ بھرا بھرا چہرہ آنکھوں سے مکاری ظاہر ہوتی تھی۔ ٹھوڑی کی گولائی غیر مستقل مزاجی کو نمایاں کر رہی تھی۔ دوسرے شخص کی صورت زیادہ تفصیل کی محتاج ہے وہ ایک بلند بالا نوجوان تھا۔ لمبے بازو، فراخ چھاتی۔ چہرے سے متضاد جذبات پیدا تھے۔ تنگ پیشانی لمبی ناک۔ رخسار اُبھرے ہوئے۔ آنکھوں سے ایک بے نیازی کی شان ٹپکتی تھی۔ مگر ہونٹوں کا ایک خاص خم عشرت پسندی پر دلالت کرتا تھا۔ داہنے ہاتھ کی چھنگلی میں انگوٹھی کا ایک

قیمتی نگینہ چمک رہا تھا۔ اس نے سگرٹ کا ایک کش لیا۔ اور پھر کمرے کے سامان کو بغور دیکھ کر کہا۔
بیوقوف آدمی میں آج اپنا سب سے بڑا شکار پھنسانا چاہتا ہوں۔ اور کمرے کی یہ حالت"۔
دوسرے شخص نے کچھ گھبرا کر کہا۔" میں اب تمہارے کسی کام میں شرکت گوارا نہیں کر سکتا۔ آج سے اس کمرے میں جوئے کی میزیں نہ بچھائی جائینگی"۔
جوّاد نے قہقہہ لگایا۔"سات سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ ہم گناہ میں شریک کار ہیں۔ عین اسوقت جب زندگی خوشگوار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تم گھبرا رہے ہو۔ مردخُدا خیال تو کرو۔ کہ میں تمام ہمّت کو اس آخری پانسے پر لگا رہا ہوں۔ اگر قسمت نے یاوری کی۔ اور تم نے بُزدلی نہ دکھائی تو ہم لکھ پتی ہو جائیں گے۔ لکھ پتی سنتے ہو"۔
سعید نے جو اس تقریر سے مرعوب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سنبھلنے کی ایک ناکام کوشش کی۔
" زیادہ طمع نہ کرو۔ ہم کافی روپیہ کما چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ یہ ہوس ہمیں قانون کے پنجے میں پھنسا دے"۔
دوسرے نے گویا اس بزدلی پر جھنجھلا کر کہا۔" عمر نے تمہارا سر پھرا دیا ہے۔ اب تمہاری رگوں میں وہ خون حرکت نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے سات سال پہلے میں تمہارا ساتھی بن گیا تھا"۔
سعید نے اس زمانہ کی نسبت خیال دوڑاتے ہوئے کہا۔" آہ وہ کیسا وقت تھا جب میں تمہارے پھندے میں آ گیا"۔
" پھندے میں آ گیا۔ میں نے تمہیں بنا دیا۔ تم شہر کے رئیس گنے جاتے ہو۔ اس سودے میں نقصان تو مجھے ہی رہا۔ میں وہی جوّاد ہوں۔ بدمعاش کا بدمعاش۔ غنڈوں کا غنڈا۔ میں نے تمہارے لئے اتنا کچھ کیا تم میرے لئے ذرا سی قربانی نہیں کر سکتے"۔
سعید خاموش رہا۔

"سعید احسان فراموش نہ کہلاؤ"

"مجھے احسان فراموشی کا الزام نہ دو۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی دولت سے ہمیشہ تمہاری مدد کرتا رہا ہوں"

جوّاد کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسم پیدا ہوا۔

"وہی دولت جو میری وجہ سے کمائی گئی تھی"

سعید نے تنگ آکر کہا "میری تمام دولت لے لو مگر مجھے اپنے مہیب کاموں میں شامل نہ کرو"

"یہ دولت میرے لئے ناکافی ہے۔ تمہیں آج مدد کرنا ہوگی۔ یاد رکھو۔ اگر میرے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو کل تمام دنیا پر روشن ہو جائیگا۔ کہ سعید جیسے دولتمند کے مکان پر کیا ہوتا رہا ہے عائشہ اور صفیہ قاہرہ کی عدالت عالیہ میں گھسیٹی جائینگی۔ اور میں سرکاری گواہ بن کر تمام رموز کو طشت از بام کر دونگا۔ آہ۔ کیا اچھا منظر ہوگا۔ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں عائشہ اور صفیہ کے گداز بدن سپاہیوں کی کرخت گرفت میں۔ اور اس عالیشان مکان پر حکومت کا قبضہ ہوگا"

سعید نے کہا "خاموش۔ دیوار ہم گوش دارد"

یہ کہکر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گویا کمرے میں سے کوئی سپاہی نکلکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیگا۔

جوّاد نے اور زیادہ تندی سے کہا مجھے مجبور نہ کرو۔ اگر آج مجھے کافی روپیہ حاصل ہوگیا تو میں اپنی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دونگا۔ اور تم جوّاد کو پہچان نہ پاؤ گے"

سعید نے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر کے جواب دیا۔

"اچھا آج آخری بار ایک جلسۂ عیش منعقد کیا جائیگا۔ جو گذشتہ تمام جلسوں کو مات کر دیگا

ضیافت نظر کیلئے صفیہ اور عائشہ کو موجود کیا جائیگا۔ اور عائشہ آج آخری دفعہ اپنا مشہور ناچ "رقص شباب" ناچے گی۔ وہ اپنے تمام انداز و ادا کو صرف کر دیگی۔ کہ تمہیں اس قسمت کی بازی میں کامیابی نصیب ہو۔ مگر یاد رکھو۔ اگر تم اس دفعہ کامیاب رہے تو پھر میرے مکان کے دروازے تمہارے لئے کبھی نہ کھلینگے۔"

جواد نے خود اعتمادی کے انداز سے کہا۔ جواد جس کام کو کرنے کی ٹھان لے۔ اسے ضرور پورا کریگا۔ اور یہ کہکر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

(۴۳)

جواد سر جھکائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ کہ اُسے اپنے پیچھے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ پھر یکایک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جواد نے مُڑ کر دیکھا۔ عائشہ کھڑی ہنس رہی تھی۔ اس نے ایک سفید گون پہن رکھا تھا۔ جس کی سیاہ پٹی سفیدی کے مقابلہ میں بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جواد کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔

"تم یہاں کہاں"

عائشہ نے آہستہ سے جواب دیا "کیا میری موجودگی تمہیں ناخوش کر دیتی ہے"

"تمہاری موجودگی مجھے ناخوش کیوں کرنے لگی۔

"تو کیا میرا آنا تمہارے لئے خوشگوار ہے"

جواد نے سوال کو ٹال کر کہا۔ صفیہ کہاں ہے"

عائشہ نے جھنجھلا کر کہا "صفیہ ہر وقت صفیہ تم اسے مجھ پر ترجیح کیوں دیتے ہو"

یکایک جواد پر حقیقت روشن ہو گئی۔ عائشہ کی اس بے معنی جھنجھلاہٹ نے جواد کو وہ کچھ سمجھا دیا۔ جو کوئی عورت دفتروں میں نہیں سمجھا سکتی۔

اب اس نے بہت نرمی سے کہا۔ "عائشہ تم میں ابھی تک بچپن ہے۔"

وہ ضبط نہ کرسکی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ مگر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جوّاد سمجھتا تھا کہ اس وقت اُس کو تسلی دینا یا ہاتھ لگانا ہلاکت ہے۔ وہ مغلوب تھی لیکن ذرا سی کمزوری اسے غالب بنا دیتی۔

پھر جوّاد نے اُس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں کے آگے ایک اور تصویر آ گئی۔ اسے اپنی محبت کا زمانہ یاد آیا۔ وہ نوجوان تھا۔ اور ناتجربہ کار ہوس نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ایک بھولی ہوئی بہار کے موسم میں، اس موسم میں جب پھول کھلتے ہیں۔ اور سبزہ لہلہاتا ہے۔ اس نے بھی ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔ مگر وہ ناپاک محبت تھی۔ اس لڑکی نے اپنے شوہر کی امانت کو جوّاد کے قدموں پر نثار کر دیا۔ آہ وہ کس قدر ایثار کرنے والی عورت تھی۔ بلند بالا۔ کنول کی سی آنکھیں رکھنے والی۔ بالکل بھولی۔ مگر جوّاد نے اس کی محبت کی قدر نہ کی۔ وہ جلد اس فرسودگی سے گھبرا گیا۔ اب اس کی التجائیں جن میں پشیمانی اور ندامت بھی شریک تھی جوّاد کے دل پر کارگر نہ ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی۔

"جوّاد مجھے چھوڑ کر نہ چلے جانا۔" آخر کار وہی ہوا۔ جس کا اسے خوف تھا۔ خزاں آ گئی۔ اور پھول مرجھانا شروع ہوا۔ جوّاد کی محبت بھی ایک دن مرجھا کر رہ گئی۔ ایک دن وہ ناگہاں غائب ہو گیا۔ اور فریب خوردہ معصوم نے خودکشی کر لی۔ وہ انہیں خیالات میں غرق تھا کہ عائشہ نے اس کے شانہ پر سر رکھ دیا۔ جوّاد نے سختی سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ مگر پھر لجاجت سے کہا۔ عائشہ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں۔

اُس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کہا۔

"کیا تمہیں صفیہ سے محبت ہے۔"

جوّاد نے پرسکون آواز میں کہا۔ "میں اب کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔"

عائشہ نے جواب دیا میں محبت کی طالب نہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ تم میری محبت سے واقف ہو گئے۔ مگر یاد رکھنا۔ تم نے عائشہ کی محبت کو ٹھکرایا ہے۔ میری محبت رقابت کو گوارا نہیں کر سکتی۔ یا تو تم اپنی باقیماندہ زندگی بغیر محبت کے بسر کرو گے یا مجھ سے محبت کرو گے۔

وہ جھپٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اب اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا۔ اس ہستی کا پتہ لگانا جو جواد کی محبوب تھی۔ وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ اسکے سامنے لاکھوں دفعہ اظہار آرزو کیا گیا تھا۔ اسے کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنا معلوم ہو چکا تھا۔ گفتگو سے تمام دل کے بھیدوں کو پالینا اس کا ایک ادنی سا کرشمہ تھا اس کے تجربہ نے گواہی دی کہ جواد یا تو کسی اور سے محبت کرتا ہے یا ایسی محبت میں مبتلا رہ چکا ہے۔ جس کی یاد اس کے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اس کا مستقل ارادہ تھا کہ دونوں صورتوں میں وہ جواد کے محبوب کو ڈھونڈ نکالیگی۔ اور پھر . . . .

اس نے اپنی ریشمی پیٹی کی طرف دیکھا۔ جس میں ایک طلائی خنجر کا دستہ نکلا ہوا نظر آرہا تھا۔ یہ دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔ جسے خوبصورت نقش و نگار سے مزیّن کیا گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی۔

یکایک اسے سامنے کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے اپنی پیش خدمت کو آواز دی۔ مگر وہ موجود نہ تھی۔ اس نے خود بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اور اپنے آپ کو ایک اجنبی کے مقابل پایا

"کیا میں عائشہ خانم سے مخاطب ہو رہا ہوں؟"

اُس نے اجنبی کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اس کا لباس ہندوستانیوں کا سا تھا۔ گھیر دار شلوار۔ سر پر ایک سفید عمامہ رکھے ہوئے

عائشہ نے ایک نیم تبسم میں اپنی تمام حیرت کو چھپائے ہوئے پوچھا "آپ مجھے کس طرح جانتے ہیں؟"
وہ جھک کر آداب بجالایا "کون ہے جو قاہرہ میں آپ کو نہیں جانتا"
عائشہ نے احساس غرور سے متاثر ہو کر کہا۔ آپ کو تعریف کرنے میں کمال حاصل ہے۔ مگر اندر آجائیے۔"

وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل دیا
اپنے کمرے میں پہنچکر عائشہ نے اسے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا "کہئے کیسے آنا ہوا"
اجنبی نے عائشہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا بیگم صاحبہ جو کچھ میں کہونگا۔ بہ صیغہ راز رہیگا"
عائشہ کا نسوانی اشتیاق بھڑک اُٹھا "آپ بلا تکلف کہئے۔ یہاں لوگوں کے راز پوشیدہ رکھے جاتے ہیں"
اجنبی کچھ عرصہ سوچتا رہا۔ وہ اپنی آنکھوں کو سامنے کی دیوار پر گاڑے خیالات میں غرق تھا۔ عائشہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کرخت سے نقش ونگار پر عمر نے اپنا نقش ثبت کیا تھا۔ اس کے ہاتھ کسی اندرونی جذبے سے کانپ رہے تھے۔
یکایک وہ بولا "کیا میں آپ پر بھروسہ کرسکتا ہوں، اور یہ کہکر اس نے اپنی تیز آنکھیں جن میں پاگلوں کی سی خونی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ عائشہ کی طرف پھرائیں۔ وہ جھجک گئی۔ اور خوف سے لبریز آواز میں جواب دیا "کس بات کی نسبت
اجنبی نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میری رسوائی کی داستان مگر لو سنو۔ عرصہ ہوتا ہے۔ کہ میں جوان تھا۔ ابھی ناکامیوں نے میرے چہرے کو ایسا مکروہ نہیں بنایا تھا۔ جیسا تم دیکھتی ہو۔ لوگ مجھے دولتمند کہتے تھے۔ مگر میں اپنی بیوی کو اپنی تنہا دولت سمجھتا تھا بہت عرصہ میں اس فریب میں مبتلا رہا۔ اور میری زندگی شہنشاہوں کی سی زندگی رہی۔ پھر ایک

دن قسمت کی متلون دیوی مجھ سے بگڑ گئی۔ بُری طرح بگڑ گئی۔ مجھے بے زر ہو کر روزگار کی تلاش میں باہر جانا پڑا۔ غریب الوطنی میں میرا سہارا صرف بیوی کا خیال تھا۔ جس نے مجھے زندہ رکھا۔ آخر کار زمانے نے ایک اور نیا ورق بدلا۔ میں پھر امیر بن گیا۔ ایک جذبہ مسرت سے لبریز۔ ایک احساس امید سے لمحوں میں گھر جا پہنچا۔ مگر مجھے معلوم ہوا۔ کہ میری بیوی مر چکی۔"

وفور جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر اس نے اپنے آپ کو روک کر زیادہ پرزور آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اُس نے خودکشی کر لی تھی۔ مجھ پر مصیبت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا بہت عرصہ مجھے اس بات کی تلاش رہی۔ کہ اس کی خودکشی کا باعث کیا تھا۔ مگر مجھے کچھ پتہ نہ ملا۔ ایک دن اتفاق سے میں اپنے ردّی خطوط کو پھاڑ رہا تھا۔ کہ ان میں سے چند مجھے اپنی بیوی کے نام ملے۔ جن کا سوادِ تحریر میرے خط سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے انہیں کھول لیا۔ وہ عاشقانہ خط تھے۔ اُن خطوں سے مجھ پر تمام حقیقت آشکارا ہو گئی۔ انہیں خطوں کا لکھنے والا میری بیوی کا قاتل تھا۔ وہ ان ذلیل ہستیوں میں سے تھا۔ جو محبت کے نام کو بدنام کرتی ہیں۔ بزدل۔ کمزور ناتواں ہستی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جب تک اسے نہ ڈھونڈ نکالوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تمام ملکوں کو چھان مارا۔ مگر میرے راجپوتی خون کا جوش فرو نہ ہوا۔ آخر مجھے پتہ مل گیا۔

عائشہ جو اس کے ہر ایک لفظ کو بڑے غور سے سُن رہی تھی۔ چونک اٹھی۔

"وہ کون شخص ہے؟"

اجنبی نے سوال کو ٹال کر پوچھا۔ "بیگم صاحبہ اگر آپ کے ملک میں کوئی ایسی حرکت کرے تو اسے کیا سزا دی جاتی ہے؟"

عائشہ نے چھوٹتے ہی جواب دیا "موت"

"ہاں ہاں موت۔ وہ شخص آپ کے ہاں ہے۔ آپ خود اس کی زندگی کی نسبت حکم لگا چکی ہیں۔"

کمرے کی فضا ایک دردناک چیخ سے گونج اٹھی۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا تمہارا مطلب جواد سے ہے۔"

"جواد۔ ان دنوں اس کا نام کچھ اور تھا۔"

عائشہ نے پہلو بدلا۔ "کیا تم نہیں سمجھتے۔ کہ جو کچھ تم نے کہا ہے۔ میں تمہیں اس کی بنا پر پولیس کے حوالے کر سکتی ہوں۔"

اب اجنبی کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ کچھ عرصہ وہ خاموش رہا پھر اس کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہوا۔

"قاہرہ کی حسین ترین عورت نے اپنا محبوب اچھا نہیں انتخاب کیا۔"

اس نے تن کر جواب دیا۔ "انتخاب میرا ہے۔ آپ کا نہیں۔"

اجنبی نے ایک بے پناہ تیر چلایا۔ "مگر آپ کے محبوب کا انتخاب اچھا تھا۔"

عائشہ نے رقابت سے جل کر کہا۔ "خاموش۔"

اجنبی ہنسا۔ "بیگم صاحبہ۔ اس نے ہم سب کو اُلّو بنایا ہے۔ اس کا زندہ رہنا ٹھیک نہیں۔ کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ وہ آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اسے صفیہ سے محبت ہے۔"

اور آخری جملے نے عائشہ کی تمام قوتوں کو شکست دیدی۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھ لیا۔ مگر معاً اس کے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا۔ اس نے اچھل کر پوچھا۔ "تمہیں یہ کیسے

مطالبہ ہم سے ہے۔"

غیور راجپوت نے غرور سے جواب دیا۔ "میں جوّاد کی نسبت کیا نہیں جانتا۔ کیا اب آپ میری مدد کرینگی۔"

اس نے ایک اضطراری فیصلے سے مجبور ہو کر جواب دیا۔ "بیشک بتاؤ میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتی ہوں۔"

اس نے کہا میری تجویز مکمل ہے۔ آپ کا صرف اتنا کام ہوگا۔ کہ آپ مجھے جوّاد کے کمرے میں کہیں چھپا دیں۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ کہ آج تک میں نے جوّاد کو اسکی اصلی صورت میں نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ وہ پولیس کے خوف سے باہر لباس تبدیل کر کے جاتا ہے۔ وہاں اور بھی لوگ موجود ہونگے۔ آج اس نے ایک اور شخص کو یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ میں ان سب میں سے اسے پہچان نہ پاؤنگا۔ آپ اپنے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول رکھیں اور رقص کرتے کرتے وہ پھول جوّاد کی گود میں ڈال دیں۔ آگے میرا کام ہے۔"

(۵)

ملحقہ کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ چھت سے صرف ایک لمپ لٹکا ہوا تھا۔ جس کی روشنی تاریکی کو نمایاں کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی میز کے ارد گرد تین چار آدمی جوا کھیل رہے تھے۔ جوّاد نشے میں بدمست تھا۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شراب کا ایک جام اُٹھایا۔ اور سعید کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نہیں پیتے حد کرتے ہو۔"

یہ کہہ کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔

کمرے کے ایک گوشے میں عائشہ اور صفیہ ناچ رہی تھیں۔ اندھیرے میں ان کے ارغوانی

لباس آگ کے شعلوں کی طرح چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ناچتے ناچتے عائشہ سعید کے قریب آ گئی۔ اس کے پیازی لبوں پر ایک خوشگوار تبسم تھا۔ مگر یہ تبسم کرب کی انتہائی شدتوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس کی پیشانی پر پہلے سے شکن پڑے ہوئے ہیں۔ نرگسی آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے۔ کان کی لویں تمتمائی ہوئی ہیں۔ وہ جواد کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ جو میز پر سے روپوں کا ایک انبار سمیٹ کر اپنے آگے رکھ رہا تھا۔

اس نے عائشہ کی طرف دیکھ کر کہا "آج میری قسمت کا ستارا عروج پر ہے"

اس نے اپنے جذبات کو چھپا کر جواب دیا "نظر تو یہی آتا ہے"

وہ بہت عرصہ کھیلتی رہی حتیٰ کہ جواد کے آگے روپوں اور نوٹوں کا انبار لگ گیا۔ اب اس کی بدمستی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔

عائشہ پھر رقص کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول تھا۔ اس نے ایک پتی نوچی۔ اور فرش پر پھینک دی۔

بیداغ سفید غالیچے کے مقابلہ میں وہ پتی تازہ خون کا ایک داغ معلوم ہونے لگی عائشہ اور آگے بڑھی اور بڑھ کر پھول سعید کی گود میں ڈال دیا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ اور سعید نے اپنی چھاتی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی قمیص پر خون کا ایک داغ نمودار ہوا۔ اور حیرت انگیز سرعت سے بڑھتا گیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی۔ مگر چیخ اس کی لبوں تک آ کر رہ گئی اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑا۔

ایک بے حس حرکت لاش۔

اسی اثنا میں تاریک پردوں کے پیچھے سے ایک سایہ نما صورت بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نکل کر غائب ہو گئی۔ جواد کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ کرسی پر سے چونک کر اٹھا۔ اور لرزتی ہوئی آواز

میں عائشہ مخاطب کرکے کہا۔

"ناپاک عورت تو نے ایک اور گناہ کا بوجھ سر پر لیا۔ میں جانتا تھا۔ کہ سعید نے تجھے اس ذلت آمیز زندگی کے بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تو اس سے اس طرح انتقام لیگی۔" اور یہ کہکر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ باقی تمام لوگ بھی اسکے تعاقب میں چل دئے۔

عائشہ کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ اس کا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے سرمگیں آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ چہرے پر انتہائی اذیت کی علامات نمودار تھیں۔ اس نے وفور جذبات سے مجبور ہو کر باآواز بلند کہا۔

"یہ ہے گناہ کی قربانی کا نتیجہ۔ آہ جوّاد نے کیا سمجھا" اور بیہوش ہو کر کمرے میں گر پڑی۔

سید عابد علی عابد

شیر افضل

(پلاٹ ایک انگریزی نظم سے ماخوذ ہے)

عورت! ناتواں عورت، میں خدا جانے کیا جادو ہے کہ مرد کو غلام بنالیتی ہے۔ مرد کی آنکھوں پر شہوانی جذبات کی پٹی کچھ اس طرح بندھی ہوئی ہے۔ کہ وہ اس پست قامت غیر متناسب لاغر نسل کو جسم لطیف کہتا ہے۔ علم و ہنر سے بے بہرہ، فنون لطیفہ سے ناآشنا، جھوٹ کا مجسمہ، فتنہ و فساد کی بنیاد، عورت نے ہماری جبلت پر ایسا قابو پالیا ہے کہ ہم اپنی ذلت کو محسوس نہیں کرتے ہم اس کی دغابازی کا روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس کی احسان فراموشی کا تلخ تجربہ اُٹھاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں

زہرہ، میری پیاری زہرہ برسوں کی محبت کے بعد مجھ کو دغا دے گئی۔ سطحی رسموں کے پابند کچھ کہیں مگر وہ میری بیوی تھی۔ ہماری شادی دلی پیمانِ وفا سے ہوئی تھی۔ اور جب میں نے

اُس کے خفیہ خطوط اڑا لئے۔ جو عورت کی مکاری کا مرقع ہیں۔ اس نے اپنا سر میرے قدموں پر رکھ دیا۔ میرا ہاتھ اُٹھا کہ اس ناپاک ہستی کا خاتمہ کر دے۔ مگر مجھ پر میری بزدلی، وہ بزدلی جسے آدمی رحم کہتے ہیں، غالب آگئی۔

اس دن سے میں دنیا کی سیاحت کر رہا ہوں۔ ہزاروں انسان دیکھے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی ایسا بہادر نہیں ملا۔ جو عورت کی غلامی سے آزاد ہو۔ مشہور فاتح۔ شیروں سے تن تنہا مقابلہ کرنے والے جوان اس میدان کے مرد نہ نکلے۔ ہاں شیر افضل ایک ایسی ہستی ہے۔ جو مرد کہلانے کا مستحق ہے۔

صحرائے سندھ کے شمال مغربی کنارے پر ایک سرسبز گاؤں درگئی ہے۔ میں وہاں ایک سرائے میں ٹھیرا ہوا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ رقاصۂ فلک کے نیلگوں دوپٹہ پر سلمے کی صناعی نمایاں تھی۔ ریت کا سمندر ستاروں کی دھندلی روشنی میں لہریں مار رہا تھا۔ دور افق میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے اونٹ کے کوہان کی طرح اُبھرے ہوئے تھے۔ سامنے باغ میں گویا ستاروں کی بارش ہو رہی تھی روشنی کے قطرے گر گر اچھل رہے تھے۔ خوشبو سے لدی ہوئی ہوا میں جگنو ناچ رہے تھے۔ جیسے اندر کے اکھاڑے میں رقص آتش ہوتا ہو۔

ساربان تھکے ہوئے اونٹوں کے پاس بیٹھے تھے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حسن و عشق ان کی کھلی ہوا میں رہنے والوں میں بہت ہے۔ عورت کی فطرت پر بحث شروع ہو گئی سب اپنے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے۔ مگر شیر افضل خاموش تھا۔ دو تین بار لب ہلا کے رہ گیا پھر وہ زور سے کھانسا۔ سب چپ ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ کسی غیر معمولی بات کا اظہار ہو گا۔ شیر افضل نے اپنی کہانی شروع کر دی

میرا ایک دوست قتل کے جرم میں گرفتار تھا۔ بالکل بیگناہ بدقسمتی کا شکار تم جانتے ہو عدالت کی پیچ در پیچ کارروائی میں جھوٹ کا فروغ کیا سہل ہے۔

ایک دن وہ جیل سے بھاگ نکلا۔ دو تین راتیں وادیوں میں آزاد پھرتا رہا۔ آخر پہاڑوں کی تنہائی چھوڑ کر زنجیروں سے جکڑا ہوا بستی کی تلاش میں ایک گاؤں میں جا نکلا۔ ہائے! غریب زنجیروں کے کاٹنے کی امید میں آیا تھا۔ مگر ایک عورت کی ہوس نے رشتۂ عمر منقطع کر دیا۔

وہ ان آدمیوں میں سے تھا۔ جن کی دنیا عورت ہے۔ جن کے لئے لطف حیات عورت کی ذات سے وابستہ ہے۔ جن کے نزدیک سورج کا اگر کوئی فائدہ ہے۔ تو یہی کہ اس سے عورت کی خوبصورتی چمکتی ہے۔ ہوا سانس لینے کے قابل ہے تو اس لئے کہ اس سے عورت کے نرم جسم کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس کے ریشمی بال بکھرتے ہیں۔ چاند خوشنما ہے تو اس لئے کہ اُن کے دل میں محبت کے ولولے پیدا کرتا ہے۔ وہ عورت کو ایک معصوم ہستی سمجھتا تھا۔ جس کی محبت کے قابل کوئی آدمی نہیں۔ اب ایک عورت کے ہاتھوں ہی اس کا خون ہُوا۔

اس خوبصورت لڑکی نے نوجوان کو ہر طرح کی امید دلائی۔ آنکھوں نے لفظوں سے بڑھ کر مدد کا وعدہ کیا۔ پیارے پیارے ہاتھوں نے اسے جھوٹے اطمینان کے بستر پر سُلا دیا۔ صبح ہوتے ہی سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ اس دغاباز عورت کی گردن کی طلائی زنجیر میں، میرے دوست کے خون کی قیمت چمکنے لگی۔

میں اس کو قتل کر ڈالتا۔ مگر انتقام زیادہ سخت سزا کا مستحق تھا۔

میں رباب بجاتا ہُوا ان پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں میں جا پہنچا۔

وہ واقعی خوبصورت تھی۔ بہار کے آغاز میں جب ثمردار درختوں میں پھول اگتے ہیں۔ اس حسین لڑکی کے دروازے سے بار بار گزرنا ناخوشگوار نہ تھا۔

میں نے اس کے دل پر قابو پا لیا۔ میٹھی میٹھی باتوں سے اسے پھسلا لیا۔
درختوں پر شگوفے نکل آئے تھے۔ اور اس کی محبت کو خاوند کی واپسی کا خوف تھا۔ وہ مجھ
سے بمنت کہنے لگی "آؤ بھاگ چلیں . . . . . مگر مجھے تو انتقام لینا تھا۔
میں بھی جوان تھا۔ میں بھی اس سے محبت کر سکتا تھا۔ شفق کی سرخی میں جب اس کی
سرمگیں آنکھیں چمکتی تھیں، میرے دل میں بھی امنگیں اٹھتی تھیں۔ میں بھی جی رکھتا ہوں۔ مگر جونہی
وہ گردن پھیرتی تھی۔ اس کی طلائی زنجیریں چمک اٹھتی تھیں۔
اور مجھے یاد آجاتا تھا۔ بس آتش انتقام، جس کے شعلے میری آنکھوں سے ٹپکتے تھے۔ چھپانے
کے لئے منہ پھیر لیتا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یہ خوف تھا۔ کہ کہیں محبت میرے دل سے انتقام کو
نکال نہ دے۔

آخر خوشبودار درختوں کی گھنی چھاؤں میں ایک دن جب اس کی آنکھیں محبت سے سرخ
ہو رہی تھیں۔ میری آنکھیں میرے مقتول دوست کی آنکھوں سے ملیں۔ اس لڑکی کی آنکھوں
سے نہیں ہرگز نہیں۔
میں تین مہینے وہیں ٹھہرا رہا۔ وہ مجھے بھاگنے پر اکساتی تھی۔ مگر میں وہیں ٹھہرا رہا۔ اس کا حسن
زرد پڑ گیا۔ اب وہ میرے پاس آتی ہوئی ڈرتی تھی۔
ایک سہانی رات کو میں چپکے سے چل دیا۔ پہاڑیاں میری نظر سے غائب ہو گئیں۔ اور میں
پھر صحرا میں آ گیا۔

اس کے خاوند نے جلد ہی کام تمام کر دیا۔ کچھ دن کے بعد جو میں وہاں سے گذرا، تو اس
کی ننگی لاش زخموں سے چور لٹک رہی تھی۔
میرا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ دوستی بہت پیاری ہے محبت اس سے بھی پیاری ہے۔ مگر

انتقام کی لذت کچھ اور ہی ہے اس میں ایک خاص مزا ہے جو انتقام لینے والا ہی جانتا ہے۔
جب شیر افضل نے یہ کہانی ختم کی میرا دل دھڑک رہا تھا میری آنکھوں میں ایک نئی تمنا چمک رہی تھی۔ مجھے زندگی کا ایک مقصد نظر آنے لگا۔ انتقام عورت سے اس کی دغابازی کا انتقام لینا میرا فرض ہوگیا۔ آج میں اسی کام کے لئے زندہ ہوں

تاثیر

کنولا

(۱)

نسیم و صبا دونوں ہم عمر تھے۔ ساتھ ہی کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ دونوں کو قدرت سے ذوق سلیم عطا ہوا تھا۔ اپنے زمانہ کے فنون سپاہ گری سے دونوں واقف تھے۔ ان کے روشن ضمیر والدین نے زمانہ کے دستور کے مطابق اور خاندانی روایات کو مدِنظر رکھتے ہوئے نسیم و صبا کی مذہبی تعلیم کا بہت کچھ خیال رکھتا تھا۔ ذات پات کے نکتہ خیال سے دونوں میں کچھ اختلاف نہ تھا۔ رہا خاندانی عروج سو اس میں بھی صبا نسیم سے کم نہ تھا۔ مانا کہ نسیم پیدائش سے ہی شہزادہ تھا مگر صبا کی پیشانی بھی خاندانی شرافت کے نور سے منور نظر آتی تھی۔ دونوں میں دوستی تھی اور وہ بھی ایسی کہ بایہ و شاید۔ یعنے یک قالب دو جان کا معاملہ تھا۔ عنفوانِ شباب تھا۔ زیادہ تر وقت سیر و شکار میں بسر ہوتا تھا مگر صبح و شام دونوں دوست مالک حقیقی کا شکرِ نعمت بجالانے میں کبھی اپنے نورِ ایماں کو ان عابدوں کے پند و نصیحت سے اور بھی منور کرتے تھے مگر کچھ دنوں سے نسیم مغموم سا نظر آتا تھا۔

(۲)

شہر سے کچھ فاصلہ پر دامن کوہسار میں ایک چھوٹی سی کٹیا تھی۔ ایک بوڑھا دہقان اس کی زوجہ اور ایک لڑکی اس کٹیا کے مکین تھے۔ بوڑھا دہقان اور اس کی زوجہ علاقہ بھر میں اپنی راستبازی

کے لئے مشہور تھے۔ راج کی طرف سے کچھ زمین عطا تھی۔ اسی پر گذران تھی۔ لڑکی جس کا اصلی نام تو
معلوم نہیں مگر والدین فرط محبت سے کنولا کہکر پکارا کرتے تھے۔ کنولا حسن قدرت کی ایک نہایت
دلآویز جیتی جاگتی تصویر تھی۔ بوٹا سا قد۔ چودہ پندرہ کے درمیان سن وسال۔ نہایت مستانہ خط و
خال بڑی بڑی آنکھیں۔ رسیلی اور چمکدار گو یا کنول کے پھول میں شبنم کی دو کٹوریاں رکھی تھیں گھنگھر
یالے لمبے لمبے سیاہ بال ادھر ادھر شانوں پر بکھرے ہوئے چاند کو شرما دینے والا رخ درخشاں
اوراق گل ایسے نازک گلابی ہونٹ۔ سڈول چھریری نازک اندام کنولا بالکل سادہ سپید رنگ
کا دہقانی قطع کا لباس پہنے رہتی۔ دہقان کی کٹیا کا چراغ تھی۔ اور اس ویرانہ میں مثل لالہ صحرا تھی
شام کے وقت ماں باپ اور بیٹی تینوں مل کر ایک چھوٹے سے چشمہ کے کنارے بیٹھ کر جو پہاڑ
میں سے نکل کر کٹیا کے آگے سے بہتا ہوا ندی میں جا ملتا تھا۔ ناظم قدرت کی حمد و ثنا کا گیت
گایا کرتے تھے۔ کنولا کی آواز بڑی دلکش اور سریلی تھی۔ فرصت کے وقت یہ حسینہ وادی گل
میں گلگشت کرتی۔ پھولوں سے دل بہلاتی۔ گلبانگ ترنم کا لطف اٹھاتی اور ایک مستانہ روش
آہو کی مانند مرغزاروں میں ادھر ادھر پھرتی۔ مگر کچھ دنوں سے اسکی حالت میں کچھ تغیر سا نظر آنے
لگا تھا۔ کنولا کبھی کبھی آسمان کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھ لیتی اور کلیجہ تھام کر
رہ جاتی۔

(۳)

نسیم کبھی کبھی بوڑھے دہقان کے پاس شکار جاتے یا واپس آتے ہوئے ٹھہر جایا کرتا تھا۔
کنولا نسیم و صبا کو چشمہ کا ٹھنڈا پانی کٹورے میں بھر کر پلایا کرتی اور پھر خود ہی شرما کر ماں کے پاس الگ
جا بیٹھتی۔ دہقان گو شہزادہ کا ادب کرتا مگر نسیم و صبا اسے بزرگ سمجھ کر اس کی تعظیم بجا لاتے تھے
زمانہ گذرتا گیا۔ کنولا کا حسن عمر جاوداں کی طرح بڑھتا رہا اور وہ شعلۂ عشق جو نسیم کے دل میں کبھی سے

پیدا ہو چکا تھا۔ شعلہ آشامی دکھلانے لگا۔ اظہار عشق ہو کر اقرارِ اُلفت ہو چکا تھا۔ دونوں جانب سے پیمانِ وفا بندھ چکا تھا بوڑھا دہقان یہ حالات اپنی زوجہ سے سنکر خاموش تھا۔ . . . . . .
نسیم گو اکلوتا بیٹا اور وارثِ تخت و تاج تھا۔ اور کوئی امر اُس کی مرضی کے خلاف نہ ہوتا تھا۔ مگر شادی کے معاملہ میں نسیم کا باپ اس کا ہم خیال نہ تھا اور صاف کہہ چکا تھا کہ نسیم کسی عالی نسب لڑکی سے شادی کرے۔ کنولا یہ حالات نسیم کی زبان سے سُن چکی تھی اور اسی لئے دونوں کا غنچۂ دل مرجھایا رہتا تھا۔ صبا ہر چند دونوں کو تسلی دیتا۔ کنولا نے تو دل کو سنبھال لیا۔ مگر نسیم آتشِ عشق سے جل جل کر کمزور ہوتا گیا اور آخر بیمار ہو گیا۔

(۴)

شہر میں مشہور ہوا کہ کہیں دور دراز سے ایک رشی ندی کے کنارے آکر اُترا ہے۔ لوگ جوق جوق اس کے پاس جاتے اور اس کے کلام معجز بیان سے مستفید ہوتے۔ ایک روز نسیم و صبا بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر رشی کے درشن کو گھر سے چلے۔ املی کے پیڑوں کے جھنڈ میں ندی کنارے سبزے کے فرش مخملی پر رشی زانو بزانو دھرے خاموش بیٹھا تھا۔ چیتے کی ایک خوشنما کھال سے سینہ اور پشت ڈھکی ہوئی تھی۔ کمر میں گھٹنوں تک خاکی رنگ کی ایک موٹی سی چادر بندھی تھی رشی بہت ضعیف العمر تھا۔ مگر پھر بھی اسکی چتون بلا کا رعب ٹپکتا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں مگر سخت ریاضت کے باعث ان میں سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ بھاری بھاری مونچھیں گھنی ریش اور لمبی لمبی جٹیں جو برف کی طرح سپید تھیں بے ترتیبی سے شانوں پر پریشان تھیں۔ . .
نسیم و صبا گھوڑوں سے اُترے اور ان کو املی کے ایک پیڑ سے باندھ دیا۔ پھر دونوں دوست رشی کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ اور اُسے جُھک کر سلام کیا۔ رشی نے مُسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ دونوں نوجوان دوسرے

عقیدتمندوں کے پاس ہی سبزہ کے فرش پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد رشی نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر ایک ایک شخص کی طرف نگاہ ڈالی اور کہا :۔

میرے بچو زندگی وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ ابدی زندگی کا راز خود فراموشی میں مضمر ہے . . . . انسان کی ہستی کا یہی مقصد نہیں کہ محض اپنے ہی لئے جئے۔ اپنے ہی آرام و آسائش کے لئے مشقت کرے . . . . نہیں نہیں میرے بچو ایسی زندگی خود غرضانہ زندگی ہو گی اور ایک نامبارک زندگی . . . . رشتۂ حیات قائم رکھنے کے لئے انسان کھاتا پیتا ہے۔ آرام کے لئے محنت و مشقت کرتا ہے . . . . میرے دوستو! رازِ حیات انسان نفس کی آمد و شد میں مضمر ہے۔ اصول ہے کہ اگر دل کی حرکت تھم جائے تو چراغ ہستی بجھ جاتا ہے . . . . ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر موت ہے . . . . موت کا ستم سمجھ لینا ایک غلطی ہے۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ کبھی نہیں ٹل سکتا۔ ہر مرنیوالا وقت سے پہلے موت کی آمد آمد سے واقف ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں طاقت اظہار ہو یا نہ ہو . . . . ہر ایک کے لئے فنا ہے۔ جاندار ہو یا جسم بے جان . . . . . . اگر انسان کو اپنے نفس پر قدرت حاصل ہو تو وہ اپنی زندگی دوسرے کے لئے وقف کر سکتا ہے اور اپنے لئے ابدی زندگی حاصل کر لیتا ہے . . . . . . قوت ارادہ اگر موجود ہو تو دنیا میں کوئی چیز مشکل نہیں . . . . میرے بچو ابدی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ مبارک زندگی مبارک زندگی وہی ہے جو دوسرے کے کام آسکے۔"

یہ کہکر رشی خاموش ہوگیا

نسیم و صبا گھروں کو واپس ہوئے۔ دونوں خاموش تھے۔ مگر صبا جس کے پہلو میں دل حقیقت طلب تھا۔ رشی کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔

(۵)

نسیم کی بیماری بڑھ گئی ہے۔ طبیب علاج چھوڑ چکے ہیں۔ کنولا کا گلاب سا خوشنما چہرہ بالکل مرجھایا ہوا ہے۔ ماں کے ساتھ کبھی کبھی وہ بھی محل میں آجاتی ہے۔ اور نسیم کی حالتِ زار دیکھ کر دل ہی دل میں گڑھتی ہے۔ نسیم کے والدین کنولا سے پیار کرنے لگے ہیں کیونکہ انہیں حقیقتِ حال معلوم ہے۔ صبا نسیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے پہروں اس کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ اور اسے تسلی دیتا ہے مگر دل میں سمجھتا ہے کہ ع

بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی"

ایک روز نسیم کی حالت بہت خراب ہوگئی اور اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ مریض کے پلنگ کے اردگرد اس کے احباب جمع تھے۔ ماں دیکھتی تھی کہ اس کا گلِ مراد کملائے جاتا ہے۔ باپ جانتا تھا کہ نورِ نظر ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دینے کو ہے۔ صبا پلنگ کے پاس نسیم کا ہاتھ پکڑے سر جھکائے خاموش بیٹھا ہے۔ مگر ایک بڑی حسرت سے بیمار نوجوان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسی غم و الم کی حالت میں صبا کو رشی کے وہ کلمات یاد آ گئے:۔

"اگر انسان کو اپنے نفس پر قدرت حاصل ہو تو وہ اپنی زندگی دوسرے کے لئے وقف کرسکتا ہے اور اپنے لئے ابدی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔"

صبا اپنی جگہ سے اٹھا اور جھک کر نسیم کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ کچھ دیر غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا . . . .

نصف پہر کے قریب نسیم کے چہرے پر جسے سب مردہ سمجھ کر رو پیٹ رہے تھے کچھ تبسم ہویدا ہوا۔ عزیز و اقارب جُھک جُھک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جسم میں جو گذشتہ چند گھنٹوں سے بے حس پڑا تھا کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ اور تھوڑی دیر بعد نسیم نے آنکھیں کھولدیں اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑی کمزور آواز سے کنولا کا نام لیا اور پھر صبا کو پکارا۔

اب نسیم پلنگ سے اُٹھا۔ والدین کی خوشی کی کچھ انتہا نہ تھی۔ مگر نسیم اپنے احباب کو اپنے گرد و پیش دیکھ کر حیران تھا۔ اس نے ایک ایک کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اور صبا کو وہاں نہ پاکر اپنی ماں سے پوچھا۔ سب نے کہا کہ جس وقت وہ اسے (نسیم) مردہ سمجھ کر نالہ و بکا کر رہے تھے اُس وقت صبا پلنگ سے اُٹھا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور پھر کچھ دیر اس کی طرف غور سے دیکھ کر چپ چاپ باہر چلا گیا۔ نسیم کچھ دیر محوِ حیرت رہا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سوچتا رہا۔ آخر اسے رشی کی ملاقات کا واقع یاد آگیا۔ اس کے دل میں کچھ بے چینی سی پیدا ہوئی۔ اس نے جلدی سے کپڑے پہنے اور محل سے باہر نکلا۔ سب عزیز و اقارب چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیئے۔ نسیم میدان سے ہوتا ہوا سیدھا ندی کی جانب چل دیا۔ . . . .

اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شفق کی سُرخی گرد و پیش کے مناظر کو سنہری قبا پہنا رہی تھی۔ طائروں کی ٹولیاں خاموشی سے پرواز کرتی ہوئیں آشیانوں کی طرف جا رہی تھیں۔ نسیم سیدھا املی کے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف گیا۔ دور سے لوگوں نے دیکھا کہ مغرب کی جانب منہ کئے ایک نوجوان دنیا و مافیہا سے بےخبر دو زانو بیٹھا ہے . . . . .
یہ صبا تھا . . . . دوست کے قریب جاکر نسیم کھڑا ہو گیا اس کے عزیز و اقارب یہ خیال کر کے کہ صبا عبادت الٰہی میں مشغول ہے خاموش ہو گئے۔ آخر کچھ دیر بعد نسیم آگے بڑھا اور بڑی محبت سے صبا کے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ . . . . آفتاب کی ہلکے رنگ

کی سنہری کرنیں صبا کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ ایک جسم بے جان تھا۔ . . . .

صبا نے قوت ارادہ کی بدولت اپنی زندگی اپنے عزیز دوست نسیم پر نثار کر کے اپنے لئے ابدی زندگی حاصل کر لی تھی۔ اس نظارہ کا لوگوں پر بہت اثر ہوا۔ نسیم بہت دیر تک اپنے محب صادق کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں تھا اور وہ بہ اندازِ خاموشی صبا کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا تھا . . . .

لوگوں نے دیکھا کہ ندی کے کنارے کنارے ایک نوجوان عورت جلدی جلدی چلی آ رہی ہے اس عورت کا لباس بالکل سپید تھا۔ یہ دہقان کی بیٹی کنولا تھی۔ کنولا کو نسیم کے کچھ واقعات معلوم ہو چکے تھے اور وہ نسیم کی تلاش میں آ رہی تھی۔ نسیم کے پاس پہنچکر کنولا صورتِ واقعات سے آگاہ ہوئی اور اس کے پاس ہی بیٹھکر نہایت دلسوز آواز سے دُنیا کی بے ثباتی کا ایک گیت گایا۔ سب لوگ اس میں شامل ہو گئے

سورج مغربی گھاٹیوں میں منہ چھپا چکا تھا۔ املی کے پیڑوں میں طیور بسیرا کر رہے تھے اور مغرب کی جانب آسمان پر ایک چھوٹا سا ستارہ بڑے تعجب سے اس نظارہ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر نسیم کا باپ آگے بڑھا۔ اور کنولا اور نسیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولا :-

"میرے بچو صبا نے ابدی زندگی پا لی . . . . چلو گھر چلو اور دونوں مل کر اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو"

ایم۔ ایم۔ اسلم

مترجمات تاثیر

محمد الدین تاثیر ایم۔اے کے قلم سے

"جواہر منشور" یعنی آئرلینڈ کے مشہور ادیب لارڈ ڈن سینئے کی تحریروں کا ترجمہ۔ ٹیگور کے طرزِ تحریر کے مداحوں اور مخالفوں کو صلائے عام ہے کہ دیکھیں کہ صحیح جوانمردانہ جذبات کو کس دل گداز انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اردو زبان کی ترقی فقط ایسے بامذاق ترجموں سے ہی ہو سکتی ہے . . . . شائع ہو گئی ہے . .

"سلومے" **مشہور ڈرامہ نویس** اوسکر وائلڈ کا فرانسیسی شاہکار۔ یہ ترجمہ برسوں کی محنت کے بعد کیا گیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اسے اس قسم کی تحریروں کے لئے ایک معیار منصور کیا جائیگا:

"ایک آتشیں جذبات سے بھری ہوئی دوشیزہ ایک مقدس انسان کو ورغلانا چاہتی ہے اور اس کا سر کاٹ کر بوسہ لینے کی حسرت کو پورا کرتی ہے"

ایک تلاطم افزا کتاب ہے۔ مطبع میں جا چکی ہے۔

"مقدس فاحشہ"۔ اناطول فرانس جو حال ہی میں فوت ہوا ہے واحد فرانسیسی تھا جسے افسانہ نویسی کے لئے نوبل پرائز ملا تھا۔ اس کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ قدیم مصر کی معاشرت کا ایک ورق ہے۔ عیش و عشرت کی راتوں اور معبدوں کی زندگی کا صحیح نمونہ ہے۔

"ایک پادری ایک فاحشہ کو نصیحت کرنے آتا ہے اور اس کے دام حسن میں اسیر ہو جاتا ہے اور خود اسے گناہ کے لئے اکساتا ہے مگر وہ فاحشہ اپنے افعال سے توبہ کر لیتی ہے"۔

جذبات کی کشمکش کا ایک دلکش مرقع ہے :۔ کاتب کے پاس ہے

افواہیں

"اثرِ آہِ دلِ زار کی افواہیں ہیں :: یعنی مجھ پر کرمِ یار کی افواہیں ہیں

افواہیں کس طرح پھیلتی ہیں اور کیا کیا اثر پیدا کرتی ہیں"

فرانس کے ایک ماہرِ نفسیات نے اس موضوع پر دو ضخیم جلدیں لکھی ہیں۔ لیکن جو دلفریبی ایک افسانہ میں ہوتی ہے وہ ان میں کہاں۔ یہ کتاب تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔

(۱) ایک ڈرامہ۔ آئرلینڈ کے ایک میلے میں ایک افواہ کا پھیلنا۔ لیڈی گرگوری کی تصنیف ہے

(۲) رسی کا سانپ۔ دنیا کے بہترین مختصر افسانہ نویس گی ڈی موپاساں کا شاہکار۔ زمین سے ایک دھاگا اُٹھانے کے گناہ کی سزا کا حال۔ ایک افواہ کے ارتقائی مراتب کی توضیح

(۳) بوسہ۔ روس کے بہترین افسانہ نگار کا ترجمہ۔ ایک افواہ کا اثر

ایک ماہ تک چھپ جائیگی

دیوان غالب مصوّرہ

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا"

مشہور مصور عبدالرحمن چغتائی نے غالب کے اشعار کو رنگین جامہ پہنایا ہے اور جس پر محمد الدین تاثیر ایم۔ اے۔ نے ایک مبصرانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے جسمیں غالب کی شاعری پر جدید نقطہ نظر سے بحث کی ہے تصاویر کے بلاک یورپ میں تیار کرائے گئے ہیں آرڈر ابھی سے آجانے چاہئیں ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار اُٹھانا ہوگا

انڈین ریویو۔ جولائی ۱۹۲۲ { یورپ کی سب سے بڑی نمائش اسمبلی میں چغتائی کی تصاویر فن کے ہر نقطۂ نظر سے اعلیٰ ترین تھیں }

شمع شبستاں { کا دوسرا ایڈیشن جسمیں ملک کے بہترین افسانہ نگاروں کے [illegible] مجموعہ افسانے درج کئے گئے ہیں ہر ایک افسانہ [illegible] تصاویر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کتاب زیرِ طبع ہے }